اسلام کے اقتصادی نظام

کے

اُصول اور فلسفہ

خطبات

حضرت امیر المومنین حافظ مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالث

امام جماعت احمدیہ ایدہُ اللہ تعالیٰ بنصرہِ العزیز

تعارف

سیدنا حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے گذشتہ دنوں" اسلام کے اقتصادی نظام" کے متعلق متعدد خطبات بیان فرمائے تھے۔ ان خطبات میں حضور نے اسلام کے اقتصادی نظام کے اصول اور فلسفہ کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا اور بتایا کہ جو اقتصادی نظام اسلام نے دنیا کے سامنے رکھا ہے دنیا کا کوئی اور اقتصادی نظام نفع رسانی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کسی اور نظام کے ماننے والے اپنے دل کی خواہشات کے مطابق اس کی خوبیاں بیان کرتے رہیں تو اور بات ہے، لیکن ٹھوس دلائل کے ساتھ کوئی نظام اس بات کو ثابت نہیں کر سکتا کہ اس نے انسانیت کے حقوق کی اُس طرح حفاظت کی ہے جس طرح اسلام نے تمام انسانوں کے حقوق کی مکمل حفاظت کی ہے۔

یہ خطبات چھپوا کر احباب کی خدمت میں پیش ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ان خطبات کا مطالعہ کریں اور ان میں بیان شدہ مضامین کو ذہن میں پوری طرح مستحضر رکھیں، تا اسلام کے اقتصادی نظام کی برتری اور فوقیت کو دوسروں کے سامنے کما حقہٗ ثابت کر سکیں۔

خاکسار

قاضی محمد نذیر

ناظر اصلاح وارشاد۔ ربوہ

(مغربی پاکستان)

عبادت

کی ذمّہ داریوں کو نباہنے کے لیے

تین بنیادی چیزیں

خطبہ جمعہ فرمودہ ۹ ہجرت (مئی)

۱۳۴۸ ہش

۱۹۶۹ء

"گیارہ ذمہ داریاں مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْن کی آیت کا ٹکڑا ہم پر ڈالتا ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تین ذمہ داریاں اس قسم کی ڈالیں، جن کا ان گیارہ کی گیارہ ذمہ داریوں سے تعلق ہے اور دراصل ان ذمہ داریوں کو صحیح طور پر نباہنے کے لیے وہ تین چیزیں بنیاد بنتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کے نباہنے سے جو عمارت کھڑی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی محبت کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے فدائیت کی اور اللہ تعالیٰ کیلئے ہر قسم کے ایثار کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے ظلم سہنے کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے ظلم کو معاف کرنے کی وغیرہ وغیرہ جتنے نیک اعمال ہیں ان سے ایک بنیاد قائم ہوتی ہے۔ جو جنت میں گھر بنتا ہے وہ یہی گھر ہے نا۔ جو ہم اس دنیا میں روحانی طور پر تیار کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کی بنیاد تین چیزوں پر قائم کی گئی ہے۔ ثبات قدم، صلوٰۃ اور زکوٰۃ۔"

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

تشہد و تعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات تلاوت فرمائیں:۔

وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○

(الذّٰریٰت ۵۱ : ۵۶، ۵۷)

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ

وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ○

(البیّنۃ ۹۸ : ۶)

اس کے بعد حضور نے فرمایا:

مَیں نے پچھلے خطبات میں بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی ان آیات میں جو مَیں خطبہ سے پہلے تلاوت کرتا ہوں ہمیں اس طرف متوجہ کیا ہے کہ انسانی پیدائش کا مقصد یہ ہے کہ بندے اور اس کے خالق اور ربّ کے درمیان عبودیت تامہ کا تعلق قائم ہو جائے اور اُس کا بندہ اسی کی عبادت کرے اور پھر بتایا کہ عبادت سے اِس قسم کی عبادت مراد نہیں جو دُوسرے مذاہب والے اپنے خیال کے مطابق یا بگڑی ہوئی تعلیم کے مطابق کرتے ہیں مثلاً دنیا میں بعض مذاہب ایسے ہیں جو ہفتے میں ایک بار کسی معیّن وقت میں کسی خاص جگہ پر عبادت کر لینا کافی سمجھتے ہیں اور انہیں یہ خیال ہوتا ہے کہ اس طرح وہ حق جو اللہ تعالیٰ نے بطور ربّ اور خالق اور رحمٰن اور رحیم اور مالکِ کُل ہونے کے ہم پر قائم کیا تھا وہ ہم نے ادا کر دیا۔ بعض ایسے مذاہب ہیں جن کے لیے ہفتے میں ایک دن بھی کسی خاص جگہ جمع ہو کر عبادت کرنا ضروری نہیں قرار دیا گیا، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ محض خیالوں خیالوں میں اللہ تعالیٰ کو یاد کر لینا کافی ہے پھر بندے پر اس کے ربّ کے تمام حقوق جو ہیں وہ ساقط ہو جاتے ہیں، ذمہ داریاں جو ہیں وہ ادا ہو جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی ان آیات میں یہ فرمایا ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا تھا تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ہو کر کرو اور جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں یہ فقرہ انسان پر عبادت سے تعلق رکھنے والی گیارہ ذمہ داریاں ڈالتا ہے۔

اختصار کے ساتھ مَیں نے ان خطبات میں ان گیارہ ذمہ داریوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

اب "دین" کے مختلف معانی کی رُو سے اپنے ربّ سے محبّت کرنے والے ایک بندے پر یہ فقرہ جو گیارہ ذمہ داریاں ڈالتا ہے وہ یہ ہیں کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہو۔ اُسے واحد و یگانہ یقین کرتے ہوئے اس کی عبادت اور پرستش کی جائے، کسی قسم کا شرک ظاہری یا باطنی، جلی یا خفی نہ ہو، نہ کسی کو عزّت و احترام کا وہ مقام دیا جائے جو صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اِس رنگ میں کرو کہ اطاعت اور فرمانبرداری صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہو، غیر اللہ کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ ڈالو، اللہ تعالیٰ کے بندے بن کر اور اس بندگی میں ہر غیر سے آزاد ہو کر اپنی زندگیوں کے دن گزارو۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور جہاں بندوں کی اطاعت کرنی پڑے وہ بھی کسی غیر اللہ کے دباؤ سے یا بُرے خیالات کے نتیجہ میں نہ ہو بلکہ احکامِ الٰہی کی روشنی میں ہو۔

حقیقی عبادت تیسری بات کا جو تقاضا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے اخلاق اللہ تعالیٰ کے اخلاق کے مطابق بنائے جائیں، کیونکہ دین کے معنے سیرت کے ہوتے ہیں۔ غیر اللہ کے اخلاق کا کوئی بدنما داغ اپنی سیرت کی نورانی چادر پر نہ لگنے دو۔ تمہاری زندگی میں جن اخلاق کا بھی مظاہرہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا پرتو اور عکس ہو، اپنی قوت اور استعداد کے مطابق اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کا رنگ چڑھانے کی کوشش کرو۔

مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ میں عبادت صحیحہ کا جو چوتھا تقاضا بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ سب تقویٰ اور زہد و تعبد اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو، کیونکہ دین کے معنے ورع کے بھی ہوتے ہیں۔ اور پانچویں ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت اللہ تعالیٰ کے بندوں پر یہ ڈالتی ہے کہ جس جس حلقہ میں انہیں اختیار اور حکومت حاصل ہو، حکومت کے معنے صرف ملک کی حکومت کے نہیں ہوتے بلکہ خاندان کا ایک حاکم ہے اُسے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے راعی قرار دیا ہے۔ ہر انسان کا ایک دائرہ اثر ہوتا ہے جس میں اس کی مرضی چلتی ہے۔ تو فرمایا جس جس دائرہ اثر میں تمہاری مرضی چلتی ہو تم یہ کوشش کرو کہ اس دائرہ اثر میں تمہاری مرضی نہ چلے بلکہ تمہارے اللہ کی مرضی چلے۔ ہوائے نفس کو یا اللہ کے غیر کو خوش کرنے کے لیے کوئی کام نہ کیا جائے کوئی حکم نہ دیا جائے کوئی ہدایت نہ ہو۔

دین کے چھٹے معنے مَیں نے یہ بتائے تھے کہ تمہاری عادات بھی ایسی ہوں کہ ان کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو،

ماحول کے بداثرات بدعادات پیدا کر دیتے ہیں اس لیے ماحول کے بداثرات سے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے بچو اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے ماتحت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے لیے اپنے میں اچھی عادتیں پیدا کرو اور انہیں پختہ کرنے کی کوشش کرو۔

ساتواں حکم یہ ہے کہ جب تمہیں غلبہ مل جائے تو غلبہ اور طاقت کا استعمال احکام الٰہی کی روشنی میں ہو اور آٹھویں یہ کہ یہ زندگی تدابیر کا مجموعہ ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں جنہیں ہم عادتاً کرتے ہیں اور اُن کو تدبیر نہیں سمجھتے۔ گرمیوں کے دنوں میں یہ بھی ایک تدبیر ہے کہ ہم رات کو باہر پانی کا گھڑا رکھتے ہیں تاکہ ہمیں صبح نسبتاً ٹھنڈا پانی مل جائے۔ لیکن یہ ایسی عادت ہے کہ کسی سے بات کرو تو وہ کہے گا یہ بھی کوئی تدبیر ہے، لیکن ہر کام جو ہم کرتے ہیں دراصل وہ تدبیر ہے کیونکہ اس سے مستقبل میں ایک نتیجہ نکلتا ہے۔ مثلاً گھر والی صبح اُٹھ کر ناشتہ تیار کرتی ہے یہ بھی ایک تدبیر ہے تاکہ رات کے بھوکے معدے کو کچھ کھانے کو ملے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ گھر میں گھر کے کاموں میں گھر والوں کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ اگر خاوند مثلاً برتن دھونے لگ جائے یا اگر اُنہوں نے کھانا اکٹھے کھانا ہے تو برتن لگائے یا کوئی اور کام کرے یہ بھی ایک تدبیر ہے اور یہ بھی ایک تدبیر ہے کہ کھانے کا ایک لقمہ بھی ضائع نہ ہو۔ کیونکہ کسی اور بھائی کا اس سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اپنی رکابی میں اتنا ہی ڈالو جو ختم کر سکو، زیادہ نہ ڈالو۔ ہمارے ملک میں یہ بُری رسم پیدا ہو گئی ہے کہ بہت سے لوگ جب مہمان ان کے ہاں آئیں وہ ان کی رکابیوں میں اپنی مرضی کے مطابق کھانا انڈیل دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے نتیجہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کی بے حرمتی ہو گی۔

دو سال ہوئے میں راولپنڈی گیا تھا تو وہاں ایک دوست کے ہاں سے دعوت کا کھانا آیا۔ مَیں نے اپنی ضرورت کے مطابق کھانا ڈالا۔ اُن کی ربّۃ البیت باہر کھڑی غور سے دیکھ رہی تھیں کہ ہمارا پکا ہوا کھانا پیٹ بھر کر کھاتے ہیں یا پیٹ پھاڑ کر کھاتے ہیں۔ ان سے رہا نہ گیا وہ اندر آ گئیں اور کہنے لگیں مَیں تو جتنی ہوں مَیں تو اپنی مرضی کی مقدار آپ کی رکابی میں ڈالوں گی۔ مَیں نے کہا اپنی مرضی پوری کر و کھانا تو مَیں نے اتنا ہی ہے جتنا مَیں نے کھانا ہے۔ لیکن اس کے نتیجہ میں (وہ کھانا تو شاید ضائع نہیں ہوا ہو گا انہوں نے محبت سے کھا لیا ہو گا) بعض دفعہ ضائع بھی ہو جاتا ہے۔

غرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ جو تدبیر بھی تم کرو وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو۔ اب پلیٹ میں کھانا ڈالنا یہ بھی ایک تدبیر ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اتنا ڈالنا جتنا آدمی کھا لے۔ دوسروں کے دکھاوے کے لیے ڈالنا یا جتنی کی اسے بھوک ہے اس سے کم ڈالنا تاکہ لوگ سمجھیں کہ بڑا عبادت گذار ہے اور اسے کھانوں سے کوئی رغبت نہیں اور پھر جب علیحدگی میں گئے تو اپنا پیٹ بھر لیا۔ یہ خدا کی رضا کے لیے اپنی پلیٹ میں کھانا

نہیں ڈالا بلکہ خدا تعالیٰ کو ناراض کرنے کے لیے اور اس کی مخلوق کو دھوکہ میں رکھنے کے لیے تھوڑی سی غذا ڈالی گئی یا اپنی امارت کا مظاہرہ کرنے کے لیے مہمانوں کے سامنے ایک ایک قاب لاکر رکھ دیا۔ یا فی مہمان ایک دیگ پکوا دی یا ایک اونٹ ذبح کر دیا تو وہ تدبیر جو ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے نہیں۔ پس آٹھویں ذمہ داری ہم پر یہ ڈالی گئی ہے کہ جو تدبیر بھی تم کرو کسی چھوٹے مقصد کے لیے وہ تدبیر ہو یا کسی بڑے اہم مقصد کے لیے وہ تدبیر ہو، جو تدبیر بھی ہو اصل مقصد اس تدبیر سے یہ ہو کہ تمہارا ربّ تم سے خوش ہو جائے۔

نویں یہ کہ جب نفس کا یا اپنے دوسرے بھائیوں کا جن کی تربیت کی ذمہ داری تم پر ہے محاسبہ کرنے لگو تو وہ محاسبہ احکامِ باری جلّ شانہٗ کی روشنی میں ہو۔ کسی تکبّر یا غصّہ یا نخوت یا حقارت کے نتیجہ میں نہ ہو۔ بعض لوگ مثلاً بے دھڑک اپنے منہ سے نکال دیتے ہیں کہ فلاں علاقے کے لوگوں میں یہ یہ بُرائیاں ہیں۔ اب یہ بھی ایک محاسبہ ہے لیکن یہ خدا تعالیٰ کو خوش کرنے والا محاسبہ نہیں ہے۔ نفس سے محاسبہ شروع ہوتا ہے اور خاموشی کے ساتھ اور احساسات اور جذبات کو ٹھیس لگائے بغیر اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے اس کے بندوں کو اس کے قریب لانے کے لیے انسان محاسبہ کرتا ہے۔

دسویں ذمہ داری حقیقی عبادت کی ہم پر یہ ڈالی گئی ہے کہ جب تم فیصلہ کرو تو اللہ تعالیٰ کے فیصلوں اور احکام کے مطابق فیصلہ کرو۔ اور گیارہویں ذمہ داری یہ ڈالی گئی ہے کہ جب تم بدلہ دو یا جب تم بدلہ لینے کی امید رکھو، ہر دو صورتوں میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ملحوظ ہو۔ بدلہ لینے کے متعلق میں نے بتایا تھا (یاد دہانی کرا دیتا ہوں) کہ مثلاً اپنے نفس کے علاوہ غیر کے ساتھ حسنِ سلوک سے متعلق بدلہ لینے کا جو اصول بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ تم نہ بدلے کی خواہش رکھو اور نہ یہ خواہش رکھو کہ وہ تمہارا مشکور ہو گا۔ جب تم نے احسان کیا ہے تو اس کے بدلے میں حسان کی امید یا خواہش یا شکر گذار ہونے کی امید یا خواہش نہ رکھو۔

بہرحال میں نے اصولی طور پر دو تین باتیں بتائی تھیں۔ یہ گیارہ ذمہ داریاں مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ کی آیت کا ٹکڑا ہم پر ڈالتا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تین ذمہ داریاں اس قسم کی ڈالیں جن کا ان گیارہ کی گیارہ ذمہ داریوں سے تعلق ہے اور دراصل ان ذمہ داریوں کو صحیح طور پر نباہنے کے لیے وہ تین چیزیں بنیاد بنتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو نباہنے سے جو عمارت کھڑی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کی محبت کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے فدائیت کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہر قسم کے ایثار کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے ظلم سہنے کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے ظلم کو معاف کرنے کی وغیرہ وغیرہ جتنے نیک اعمال ہیں اُن سے ایک بنیاد قائم ہوتی ہے۔ جو جنت میں گھر بننا ہے وہ یہی گھر ہے نا۔ جو ہم اس دنیا میں روحانی طور پر تیار کر رہے ہوتے ہیں۔

اِس کی بنیاد تین چیزوں پر قائم کی گئی ہے جن میں پہلے یہ ہے۔ حُنَفَآءَ کہ یہ ذمہ داریاں جب تم نباہو ان میں ثباتِ قدم ہو، مستقل مزاجی ہو، تمہاری ساری کی ساری زندگی اللہ تعالیٰ کے لیے گزرنے والی ہو۔ جب تم اس کی عبادت کرو تو یہ نہیں کہ چند دن عبادت کی اور چند دن چھٹی لی۔ روحانی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے جو کام کیے

جاتے ہیں ان میں رخصتیں نہیں ہوتیں بلکہ ذمہ داری کے عائد ہونے کے دن سے دنیا سے گزر جانے کے دن تک وہ کام لگاتار اور باقاعدگی سے کرنا ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ سکولوں کی رخصتوں کی طرح دس مہینے نماز پڑھی اور دو مہینے نماز سے چھٹّی ہو گئی۔ نماز باجماعت تو پانچ وقت ہی سوائے اس جائز مجبوری کے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سختی سے بچانے کے لیے ہم پر رحم کرتے ہوئے سہولت دی ہے۔ اس کے علاوہ مسجد میں آکر نماز پڑھنا ضروری ہے۔ اسی طرح وہ سینکڑوں احکامِ الٰہی جو قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں اور ان کی ہزاروں فروعات جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کی سُنّت میں پائی جاتی ہیں۔ ان پر باقاعدگی کے ساتھ استقلال کے ساتھ عمل کرنا ضروری ہے حُنَفَآءَ ہونا چاہیئے، ثبات قدم ہونا چاہیئے، استقلال ہونا چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر تو یہ شکل بنے گی کہ ہماری زندگی کے کچھ دن خدا کے لیے گذرے اور کچھ دن شیطان کے لیے گذرے۔ لیکن ہمارا خدا یہ کہتا ہے کہ اگر تم سب کچھ مجھے دینا نہیں چاہتے تو مَیں تم سے کچھ بھی لینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ پھر سب کچھ ہی شیطان کی گود میں جا کر ڈال دو اور اِس دنیا کی جہنّم اور اُس دنیا کی جہنم کے وارث بنو۔ لیکن اگر میرا بننا ہے تو میرے ہو کر ساری زندگی کے دن گذارنے ہوں گے۔ اگر تم آدھا مجھے اور آدھا میرے غیر کو دینا چاہو تو جو مجھے دو گے وہ بھی میں قبول نہیں کروں گا۔

پس فرمایا کہ عبادت اور اس کی ذمہ داریاں اور اس سلسلہ میں جو احکام بجا لاتے ہیں ان میں ثبات قدم ہونا چاہیئے استقلال ہونا چاہیئے، باقاعدگی ہونی چاہیئے اور بشاشت اور رضا ہونی چاہیئے اس کے بغیر تو انسان کو ثباتِ قدم نہیں ملتا۔

اس سلسلہ میں دوسری چیز جو بنیاد ہے وہ ہے یُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوةَ۔ اس میں دو چیزیں آگئی ہیں۔ قرآن کریم نے صلوٰۃ اور زکوٰۃ کو مختلف معانی میں استعمال کیا ہے۔ بعض جگہ تو ایک خاص عبادت جو ہم پانچ وقت فرائض کے طور پر کچھ سنتوں اور نوافل کے طور پر ادا کرتے ہیں اس کو صلوٰۃ کہا جاتا ہے اور زکوٰۃ اس مقررہ لازمی چندے کو کہا جاتا ہے جس کی تفاصیل قرآن اور احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ان دو الفاظ کو بنیادی معانی میں بھی استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن کریم کی ابتدا میں سورۃ بقرہ کے شروع میں ہی ایک بڑا لطیف اصولی مضمون بیان ہوا ہے اور اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے نزول کے بعد دنیا تین گروہوں میں منقسم ہو جائے گی۔ (۱) ایمان لانے والے (۲) کھلم کھلا انکار کرنے والے اور (۳) منافقانہ راہوں کو اختیار کرنے والے۔ وہاں ساری باتیں جو بیان کی گئی ہیں وہ اصولی ہیں۔ وہاں بھی

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (البقرۃ ۲ : ۳-۴)

میں یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ اور مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ جو دو فقرے استعمال ہوئے ہیں ان کی بجائے یہاں یُقِیْمُوا

الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوا الزَّکٰوۃَ کے دو فقرے ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں اور یہ دو چیزیں تمام اعمال صالحہ اور عبادات کی بنیاد ہیں۔

صلوٰۃ سے مُراد وہ بنیادی دعا ہے جس کے کرنے کا حکم بطور فریضہ کے دیا گیا۔ ایک وہ دُعا ہے جو ضرورت کے مطابق انسان کرتا ہے۔ ہر فرد کی ضرورت مختلف ہوتی ہے ہر شخص کی ضرورت مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ وہ حسب ضرورت اپنے رب سے مانگتا ہے اور اس کے فضل سے پاتا ہے۔ نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جُوتے کا اگر ایک تسمہ بھی ٹوٹ جائے اور اس کی ضرورت ہو تو یہ نہ سمجھنا کہ زور بازو سے تم اُسے حاصل کر سکو گے۔ بُوٹ کا تسمہ بھی تم اپنے خدا سے مانگو۔ پس ایک تو یہ انفرادی دُعا ہے جو انفرادی حالات کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، لیکن ایک بنیادی دعا ہے یعنی عاجزانہ اپنے ربّ کے قدموں پر گِر جانا جو بطور فریضہ کے قائم کی گئی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ[1] کے ایک معنی یہ بھی کیے ہیں کہ یہاں یہ حکم ہے کہ مجھ سے دعا کرو تو یہاں یہ فریضہ ہے اور آپ نے اس کی بڑی لطیف تفسیر بیان کی ہے۔ یہاں دعا کو اس دعا کے معنوں میں استعمال کیا ہے جو فرض ہے اور پھر آگے اس کی قبولیت کا وعدہ دیا گیا ہے۔ یہاں اور سورۂ بقرہ کے شروع میں اور بعض دوسری جگہوں پر صلوٰۃ کا لفظ اس دعا کے معنوں میں آیا ہے جو فریضہ ہے، ہر ایک شخص کے لیے کرنا ضروری، ورنہ عبادت اور اس کے لوازمات پورے نہیں ہوتے اور انسان سچّے طور پر اپنے ربّ کی عبادت نہیں کر سکتا۔ اور اس دعا کی ماہیت حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ بیان کی ہے کہ چونکہ بندہ اپنے ربّ کی عبادت ہی کے لیے پیدا ہُوا ہے انسانی فطرت میں یہ چیز پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے ربّ کی طرف جھکے، لیکن اس کی فطرت میں کمزوری بھی ہے۔

پس اس دعا کی ماہیت یہ ہے کہ پہلے رحمان کی رحمانیت جوش میں آتی ہے اور اپنے بندہ کو وہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ پھر اس کو تھوڑے سے قرب کے حاصل ہو جانے کے بعد کچھ ہوش آجاتا ہے اور اس کی فطرت بیدار ہوتی ہے اور جاگ اٹھتی ہے۔ پھر بندے کی فطرت میں ایک جوش پیدا ہوتا ہے کہ مَیں خدا کا قرب حاصل کروں اور پھر بندہ اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ یعنی یہ دو کششیں ہیں، ایک اللہ کی کشش جو اس کی رحمت کے جوش سے ظاہر ہوتی ہے اور ایک بندے کی کشش جو اس کی فطرت کے بیدار ہونے کے بعد یا اس کی روحانی بلوغت کے بعد ظاہر ہوتی ہے اور یہ دو کششیں مل کر بندے کو اللہ تعالیٰ کا ایک خاص مقام قرب عطا کرتی ہیں۔ یہ خاص مقام قرب صرف انسان کو عطا ہوتا ہے دوسری چیزوں کو عطا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ مَیں نے ایک خطبہ میں بتایا تھا کہ قرب کی کئی قسمیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قرب تو ہر شے کو حاصل ہے، لیکن ایک قرب عام ہے ایک قرب خاص ہے۔ بندے کو قرب خاص عطا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسلام تحریر فرماتے ہیں کہ:-

---

[1] المؤمن ۴۰ : ۶۱

”خدا تعالیٰ کی طرف کامل یقین اور کامل امید اور کامل محبت اور کامل وفاداری اور کامل ہمّت کے ساتھ جُھکتا ہے (یہاں بندے کا ذکر ہے کہ ایسا انسان جو ہے کہ جب خدا تعالیٰ کی رحمانیت جوش میں آتی ہے تو اس کی فطرت بیدار ہوتی ہے تو یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے) اور نہایت درجہ کا بیدار ہو کر غفلت کے پردوں کو چیرتا ہوا فنا کے میدانوں میں آگے سے آگے نکل جاتا ہے پھر آگے کیا دیکھتا ہے کہ بارگاہِ الوہیت ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ تب اس کی رُوح اس آستانہ پر سَر رکھ دیتی ہے۔“

(برکات الدّعاء صـ٦)

یہ ہے اس دعا کی ماہیت یعنی جب تک انسان کو یہ مقام حاصل نہ ہو وہ عبادت کا مفہوم ہی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرمایا کہ تم عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہو عبادت کے یہ تقاضے ہیں عبادت تم پر یہ ذمہ داریاں ڈالتی ہے اس لیے پہلی شرط یہ ہے کہ تم پختہ عزم کرو کہ ہم ایک دفعہ صراطِ مستقیم کو حاصل کرنے کے بعد اس راہ سے نہیں بھٹکیں گے، بلکہ خواہ کچھ ہو جائے ثباتِ قدم دکھائیں گے۔ ساری دنیا کے پہاڑ مل کر ہم پر گرنے کی کوشش کریں اور ہمیں قیمے سے بھی باریک ذرّوں میں منتقل کرنے کی کوشش کریں اور ساتھ یہ وعدہ بھی ہو کہ اگر تم اپنے ربّ سے تعلق توڑ دو تو تم اس فنا سے بچ سکتے ہو تو خدا کا بندہ کہے گا کہ نہیں مجھے اس جسم کی فانی زندگی منظور نہیں۔ روحانی زندگی اور اس کی بقا کا انحصار اس بات پر ہے کہ میرا اپنے ربّ سے تعلق قطع نہ ہو اور مَیں اس سے دُوری کی راہ کو اختیار نہ کروں۔

پس جب یہ جذب پیدا ہو جاتا ہے اور انسان کی فطرت بیدار ہو جاتی ہے تو وہ اس کے نتیجہ میں کامل یقین، کامل امید، کامل محبّت، کامل وفاداری، کامل ہمت کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف جھکتا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ فنا کے میدانوں میں سے گزرتا ہے یعنی اس پر ایک فنا وارد ہوتی ہے اور پھر جب وہ ان میدانوں کو عبور کر لیتا ہے تو کیا دیکھتا ہے بارگاہِ الوہیت ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ یہ عبادت کا حق ادا ہو گیا نا، تب اس کی رُوح اس کے آستانہ پر سَر رکھ دیتی ہے اور پھر وہ سَر اس آستانہ سے کبھی اُٹھتا نہیں۔

پس حُنَفَآءَ کے بعد یہ بتایا کہ یُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ ان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ چونکہ تم میری عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔ اس لیے اس مفہوم میں دعا کو قائم کرو۔ تاکہ اس کے اوپر وہ عمارت کھڑی ہو سکے جو تمہاری جنت کی عمارت ہے اس قسم کی دُعا کا کیا اثر ہوتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ:-

”اس دعا کے ساتھ روح پگھلتی ہے اور پانی کی طرح بہہ کر آستانۂ حضرت

احدیت پر گرتی ہے، وہ خدا کے حضور میں کھڑی بھی ہوتی ہے اور رکوع بھی کرتی ہے اور سجدہ بھی کرتی ہے اور اسی کی ظل وہ نماز ہے جو اسلام نے سکھائی ہے"

(لیکچر سیالکوٹ ص۱۶)

نماز ظل ہے اصل نہیں اصل یہ صلوٰۃ یہ دُعا ہے جو فرض ہے۔ جس کی بنیاد پر صحیح اور سچّی اور حقیقی عبادت کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ پھر فرمایا:۔

"اور روح کا کھڑا ہونا یہ ہے کہ وہ خدا کے لیے ہر ایک مصیبت کی برداشت اور حکم ماننے کے بارے میں مستعدی ظاہر کرتی ہے۔" (ایضاً)

جب آستانہ الوہیت نظر آ گیا، جب خدا تعالیٰ کا قرب ہمیں مل گیا، جب خدا تعالیٰ کے ساتھ جو حیّ وقیوم اور صفاتِ حسنہ کا مالک اور ہمیشہ قائم رہنے والا ہے اور بقا اس کی مرضی اور منشا کے بغیر ممکن نہیں۔ اور کسی فرد کو صرف اسی رنگ میں بقا ملتی ہے جس رنگ میں وہ چاہتا ہے۔ مثلاً ہمارے جسموں کو اس نے بقا نہیں دی فنا دی، لیکن ہماری رُوح کو اس نے باقی رکھا اور جسم سے زیادہ انعامات کا اسے وارث بنایا تو اس دُعا کی جو بنیادی حیثیت رکھنے والی ہے ایک خاصیت یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں انسانی رُوح خدا کے ہر حکم کو ماننے کے لیے مستعد رہتی ہے۔

اس دعا کی دوسری صفت یا دعا کے نتیجہ میں جو روح میں صفت پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی رُوح اس دعا کے نتیجہ میں اپنے ربّ کے حضور جھکتی ہے۔ چنانچہ آپؑ فرماتے ہیں:۔

"اس کا رکوع یعنی جُھکنا یہ ہے کہ وہ تمام محبتوں اور تعلّقوں کو چھوڑ کر خدا کی طرف جھک آتی ہے۔ اور خدا کے لیے ہو جاتی ہے۔" (ایضاً)

دنیا کے سارے رشتے اور تعلقات فی نفسہا اس انسان کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتے بلکہ اتنی اور اس حد تک اور اس وقت تک کوئی حقیقت ہے جتنی جس حد تک اور جس وقت تک خدا کہے کہ اس حقیقت کو اس تعلق کو قائم رکھنا ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ نے انسان پر بڑی بھاری ذمہ داری ماں باپ کی خدمت کی، ان کی عزت واحترام کی، ان کی اطاعت کی اور ان کا کہا ماننے کی ڈالی ہے۔ لیکن ایک حد بھی مقرر کر دی۔ اگر شرک کی بات کریں، خدا سے دُوری کی بات کریں تو پھر ان کی بات نہیں ماننی۔ اس سے ورے ورے ان کی عزت کرنی ہے، ان کا احترام کرنا ہے، ان کی اطاعت کرنی ہے، ادب سے پیش آنا ہے۔ انہیں اُف تک نہیں کہنا۔ ہر طرح ان کو آرام دینا ہے اور خوش رکھنے کی کوشش کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بے شمار ذمہ داریاں ہیں لیکن ساتھ یہ کہہ دیا کہ اگر شرک کی کوئی بات کریں، خدا سے دُور لے جانے والی کوئی بات کریں تو پھر ان کی بات نہیں ماننی۔ تو ایسی رُوح تمام تعلقات توڑ دیتی ہے جو خدا کے سوا ہوں۔ صرف ایک تعلق جو حقیقی تعلق ہے اس کا قائم ہو جاتا ہے اور اس تعلق کے نتیجہ میں پھر جس سے خدا جس حد تک تعلق قائم کرنے کو کہتا ہے بندہ وہ تعلق

قائم کرتا ہے نہ اس سے زیادہ نہ کم۔ گویا ہر ماسوا اللہ حقیقت میں کچھ نہیں نہ کوئی عظمت اس کی، نہ کوئی جلال اس کا، نہ کوئی عزّت اس کی، نہ کوئی احترام اس کا، نہ کوئی خوف اس کا، نہ کوئی ڈر اس کا، کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ سب کچھ خدا کے لیے ہو گیا۔ خدا سے ایک رشتہ محبّت قائم ہو گیا جس کے بعد کوئی اور رشتہ قائم نہ رہا جس کے بعد کسی اور رشتہ محبّت کی ضرورت باقی نہ رہی۔ یہ دوسری صفت ہے جو اس قسم کی دُعا میں پائی جانی چاہیئے جس کے نتیجہ میں اس روح میں بھی یہ حقیقت پیدا ہو جاتی ہے پھر آپؑ فرماتے ہیں:۔

"اور اس کا سجدہ یہ ہے کہ وہ خدا کے آستانہ پر گر کر اپنے تئیں بکلّی کھو دیتی ہے۔ اور اپنے نقش وجود کو مٹا دیتی ہے۔ یہی نماز ہے جو خدا کو ملاتی ہے۔" (ایضاً)

دوم، تو یہ تھا کہ کوئی غیر جو ہے وہ باقی نہیں رہتا۔ اس کے ساتھ جو بھی رشتہ ہے وہ خدا میں ہو کر اس کے احکام کی روشنی میں قائم ہوتا ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ اپنا وجود بھی باقی نہیں رہتا۔ اپنا وجود بھی خدا کے سپرد ہو جاتا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مضمون پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کا جو خلاصہ نکالا ہے وہ یہ ہے کہ اس اصلی اور بنیادی دعا کے لیے دو چیزوں کا تصوّر ضروری ہے۔ ایک اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا تصوّر اس کی ذات کی معرفت اور اس کی صفات کا عرفان اور اس حقیقت کا احساس کہ یہ صفاتِ کاملہ ہمیشہ اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں اور یہ کہ کوئی اور وجود اس کی صفاتِ کاملہ کے کام میں کوئی روک نہیں پیدا کر سکتا۔ جب اس کی صفت کا جلوہ ہوتا ہے تو ہر شے جو اس کے مخالف ہوتی ہے وہ ہلاک کر دی جاتی ہے، فنا کر دی جاتی ہے۔

پس ایک تو یہ تصوّر اس روح میں قائم ہوتا ہے اور ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ بڑی عظمت و جلال والا ہے اور وہ صفاتِ حسنہ سے متصف ہے اور اس کی یہ صفاتِ حسنہ ہمیشہ اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ اور کوئی اور طاقت اور کوئی اور صفت اور کوئی تدبیر اور حیلہ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کے مقابلہ میں کامیاب اور کارگر نہیں ہو سکتا۔

دوسرا تصوّر یہ ہے کہ مَیں کچھ نہیں۔ یہ اپنی ذلّت اور نیستی کا تصوّر ہے۔ دراصل عبودیت کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا جب تک انسان اس حقیقت پر نہ قائم ہو جائے کہ مَیں لاشے محض ہوں اور لاشے محض ہونے کے باوجود اس کو کام کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ غرض اپنی ذلّت اور نیستی کے ساتھ ہی اس کو یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ توفیق دے گا اور اللہ تعالیٰ توفیق دیتا ہے) وہ تائید کرے گا (اور اس کی تائید و نصرت حاصل ہوتی ہے) اور جب اس کی توفیق اور تائید و نصرت حاصل ہو جائے تو وہ وجود جو لاشے محض ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تائید سے ایسے کاموں کی توفیق پاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنے والے ہیں۔

ان دو تصوّرات کے نتیجہ میں وہ حقیقی بنیادی دُعا انسان کو حاصل ہو جاتی ہے جس میں تین خاصیتیں ہیں یعنی جس کے نتیجہ میں دُعا کرنے والے میں تین خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور جس کے نتیجہ میں اس محل کی عمارت کھڑی ہوتی ہے جو

محل روحانی طور پر اس دنیا میں جنّت کا محل اور اُس دنیا میں جنّت کا محل ہوتا ہے۔

پس یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ میں اس نماز کا ذکر نہیں جو ابھی خطبہ کے بعد مثلاً جمعہ کی نماز پڑھیں گے یا پھر مغرب و عشا۔ فجر اور ظہر اور عصر کی نماز ہر روز یہاں پڑھتے ہیں بلکہ اس بنیادی دُعا کا تعلق تمام حقوق اللہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی حق بھی ادا نہیں ہو سکتا جو اس بنیاد کے اوپر کھڑا نہ ہو۔ کیونکہ انسان اگر اپنے کو بھی کچھ سمجھے تو وہ خدا کا حق کیسے ادا کر سکے گا۔ اگر وہ غیر اللہ کو کچھ سمجھے تو وہ خدا کا حق کیسے ادا کر سکے گا۔ پس یہ وہ بنیادی دعا ہے جو ہر مومن مسلمان پر فرض ہے جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ سے وہ تعلق محبت پیدا ہو جاتا ہے جس تعلق محبت کو پیدا کرنے کے لیے انسان کی پیدائش ہوتی ہے اور وہ ان نعماء کا وارث ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن بندے کے لیے مقدر ہیں۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں بھی اسی معنے میں یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کا فقرہ استعمال کیا گیا ہے۔ غرض عبادت کی روح یہ دُعا ہے اس کے بغیر بظاہر نظر آنے والی عبادت ایک مُردہ لاشہ ہے، لیکن اگر اس عبادت میں دعا کی یہ روح پیدا ہو جائے تو پھر وہ زندہ ہے اور زندہ کا تعلق زندہ سے پیدا ہو سکتا ہے۔ زندہ روح کا تعلق پھر زندہ خدا سے ہو جائیگا پس حقوق اللہ کی ادائیگی میں روحِ عبادت یہ دعا ہے، یہ صلوٰۃ ہے جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے۔

عبادت کی کچھ ذمہ داریاں حقوق العباد سے تعلق رکھتی ہیں ویسے تو زکوٰۃ کا سارے ہی حقوق کے ساتھ تعلق ہے، لیکن نمایاں طور پر براہِ راست اس کا تعلق حقوق العباد کے ساتھ نظر آتا ہے۔ مَیں نے بڑا سوچا میرے نزدیک اس کا تعلق صرف حقوق العباد کے لیے ہی سمجھنا درست نہیں ہے ویسے زکوٰۃ روحِ خدمت ہے۔ اس دنیا میں حقوق انسانی کی ادائیگی اور نوع انسانی کی جو خدمت ہے اس کے ساتھ اس کا نمایاں طور پر تعلق ہے۔ بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو تعلق ہے وہ خدمت سے کچھ مختلف ہے، محض خادم کا تعلق نہیں بلکہ فانی کا تعلق ہے۔ اس وجہ سے وہ چیز وہاں اتنی نمایاں نہیں ہوتی، لیکن بہر حال وہاں بھی اس کا تعلق ہے۔

ایک دوسرے نقطہ نگاہ سے گیارہ کی گیارہ باتیں جن کا مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ میں ذکر ہے ان کی دوسری بنیاد زکوٰۃ ہے۔ یہ وہ زکوٰۃ نہیں جس کی شرائط پوری ہونے پر چالیسواں حصّہ یا بعض لازمی چندوں کے دوسرے مقررہ حصے ادا کیے جاتے ہیں۔ زکوٰۃ کے مختلف معانی ہیں اور بعض آیات قرآنی میں تمام لغوی معنے چسپاں ہو جاتے ہیں اور وہاں ہمیں بڑی لطیف تفسیر ملتی ہے۔

اس معنی کی رُو سے جو مَیں سمجھتا ہوں کہ بنیادی حقیقت کا حامل ہے زکوٰۃ کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کا حق تسلیم کیا جائے اور اسی کو مالکِ حقیقی سمجھا جائے اور خدا کا جو حق ہے اس کی آگے اس تقسیم میں جو اس نے اپنے کسی بندے کے سُپرد کی ہے خدا کے قائم کردہ حق کے مطابق خرچ کیا جائے۔ پس زکوٰۃ کے معنے یہ ہوئے کہ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ مثلاً ہر چیز جو میری ہے یا آپ میں سے کسی کی ہے حقیقتاً وہ اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور مالکِ حقیقی کے حکم اور

ارشاد کے مطابق اس تمام عطا کا مصرف ہونا چاہیئے، جہاں وہ حق قائم کرے وہاں وہ حق ادا ہونا چاہیئے۔ اسلام ایک حسین مذہب ہے اس نے صرف دوسروں کے حقوق کو ہی قائم نہیں کیا بلکہ خود ہر فرد واحد کے نفس کے حقوق کو بھی تسلیم کیا اور ان کی ادائیگی کا حکم دیا۔ اگر یہ حقوق قائم نہ کیے جاتے تو کسی کے اپنے نفس کا کوئی حق نہ بنتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا[1]

(بخاری کتاب الصوم باب من اقسم علی اخیہ لیفطر فی التطوع)

تیرے نفس کے بھی کچھ حقوق ہیں جو خدا تعالیٰ نے قائم کیے ہیں اور تیرا یہ فرض ہے کہ تو ان حقوق کو ادا کرے۔ ایک حق مثلاً نفس کا یہ ہے کہ اس کو متوازن غذا ملے کہ اس کی صحت قائم رہے اور اپنی زندگی میں وہ اپنی ذمہ داریوں کو نباہ سکے، وہ یہ سمجھے کہ میری زندگی کا ہر سانس اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ یہ اُسی کا ہے میرا کوئی حق نہیں کہ مَیں جس طرح چاہوں اپنی زندگی کے اوقات کو خرچ کروں۔ جب اسے نیند آتی ہے اور جسم تھک جاتا ہے تو جسم کہتا ہے مَیں نے سونا ہے اللہ کا بندہ اس وقت یہ سوچے گا کہ سونا کیوں؟ کیا خدا نے میرا یہ حق تسلیم کیا کہ اس دنیا میں تم تھک جاؤ گے اور تمہیں نیند کی ضرورت پڑے گی اس وقت نیند کی ضرورتوں کو ان شرائط کے ساتھ جو اسلام نے بڑی وضاحت سے بیان کی ہیں پوری کر سکو گے۔ یہ تمہارا حق ہے یعنی چیز خدا کی تھی اس نے اپنی رحمت سے یہ حق عطا کیا اور جب ہم اس نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو قرآن کریم کہتا ہے:

جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا (النبا ۷۸: ۱۰)

تمہاری نیند کو تمہارے لیے راحت کا باعث بنایا ہے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس میں کوئی حکمت ہونی چاہیئے۔ یہ کہنے سے کہ ہم نے تمہاری نیند کو تمہارے لیے راحت کا باعث بنایا ہے اس میں بہت سی حکمتیں ہیں۔

ایک حکمت یہ ہے کہ خدا یہ کہتا ہے کہ اگر مَیں تمہارا یہ حق تسلیم نہ کرتا کہ تم اپنی زندگی کے کچھ لمحات راحت اور آرام اور اپنی طاقتوں کو زیادہ مضبوط بنانے اور پوری طاقت حاصل کرنے کے لیے نیند لو تو تمہارا کوئی حق نہیں تھا کہ تم سوتے۔ لیکن چونکہ تمہارے جسم کو مَیں نے اس طرح بنایا ہے کہ تمہارا دل اور تمہارا دماغ اور تمہارا جسم کوفت محسوس کرے گا اور چاہے گا کہ میں نیند لوں اس لیے ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا

[1] پوری حدیث یہ ہے:۔ اِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَلِاَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا فَاَعْطِ كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ (بخاری کتاب الصوم)

اور تیرے نفس کا ایک حق یہ ہے کہ جب وہ تھک جائے اور اس کو راحت اور آرام کی ضرورت پڑے تو وہ سو جائے۔ پس ہماری زندگی کے سارے لمحات اللہ تعالیٰ کے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمارے لیے سونے کا حق پیدا کیا اور ہمیں اجازت دی کہ سو جاؤ ورنہ خدا کا مومن بندہ مرجاتا مگر اونگھتا نہ، اس کو دوسری طرف یہ بھی تو حکم تھا، نا! کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ اور وہ خدا تعالیٰ کی سنت دیکھتا کہ

لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ (البقرہ آیت ۲۵۶)

اور کہتا کہ مَیں بھی نہیں سوؤں گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے کہا پھر تو اپنی اس زندگی کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔ تیرے قویٰ آہستہ آہستہ کمزور ہوتے چلے جائیں گے۔ حالانکہ تیری ذمہ داریاں تو آہستہ آہستہ بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ تُو انہیں کیسے نباہے گا۔ پس نیند کا یہ حق قائم کر دیا اور جہاں یہ ذکر ہے کہ وہ زکوٰۃ دیتے ہیں یا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسلیم کرتے اور ہر چیز کا مصرف اور خرچ خدا کی ہدایت کے مطابق ہو تو صحیح سمجھتے ہیں ورنہ ہمارا اپنا کوئی حق نہیں۔

ہمارے ایک بزرگ کے متعلق آتا ہے کہ وہ بڑے قیمتی جبّے پہنا کرتے تھے کسی نے اعتراض کیا تو انہوں نے کہا کہ مَیں تو مونہہ میں ایک لقمہ بھی نہیں ڈالتا جب تک میرا خدا نہ مجھے کہے کہ تُو یہ لقمہ مونہہ میں ڈال اور کوئی کپڑا نہیں پہنتا جب تک خدا مجھے یہ نہ کہے کہ یہ قیمتی لباس پہن۔

دراصل اللہ تعالیٰ ہر بندہ سے اسی طرح مخاطب ہوتا ہے کسی سے اپنے مکالمہ سے مخاطب ہوتا ہے اُن قائم کردہ حقوق کو دہرانے سے جو قرآن اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت اور حدیث میں قائم ہو چکے ہیں اور کسی کے لیے وہ دہراتا نہیں لیکن مقررہ حقوق اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ہمسائے کے حقوق، بیوی بچوں کے حقوق، اقرباء کے حقوق، اہل محلہ کے حقوق، بنی نوع انسان کے حقوق غرض ہر ایک کے حقوق قائم کر دیئے ہیں اور یہ کہا کہ تیرا یہ حق نہیں ہے کہ تُو اپنے طور پر کسی کے حقوق قائم کرے۔ تو اپنا حق بھی قائم نہیں کر سکتا جب تک وہ ہماری طرف سے قائم نہ ہو۔ یہ ہیں زکوٰۃ کے معنی، یعنی ہر چیز کو خدا کا سمجھ کر، ہر حق اسی کا تسلیم کرتے ہوئے ہر شئے خدائی عطا سمجھتے ہوئے جتنی چیز جس جگہ خرچ کرنے کا حکم ہو اور جس قدر اپنے نفس کا یا کسی اور کا حق اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہو اس کے مطابق خرچ کرنا یہ زکوٰۃ ہے اور یہ بنیادی چیز ہے اور جیسا کہ مَیں نے کہا ہے اس کا تعلق نمایاں طور پر حقوق العباد سے ہے، لیکن ایک حد تک عبادت کے ہر تقاضے سے اس کا تعلق ہے۔

پس فرمایا کہ انسان عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس لیے تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ تم خدائے واحد کی عبادت کرو مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ہو کر یعنی ان تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے عبادت کے قرآن کریم میں بیان فرمائے ہیں۔ پھر یہ نہیں کہ چند دن ان تقاضوں کو پورا کرو اور پھر چھوڑ دو۔ بلکہ حُنَفَاءَ یعنی ثباتِ قدم ہونا چاہیئے۔

اگر تم میرے فضلوں کو حاصل کرنا چاہتے ہو، اگر یہ چاہتے ہو کہ تمہارا انجام بخیر ہو تو تمہیں ثابت قدم رہنا پڑے گا۔

دوسرے یہ کہ جو رُوحِ عبادت ہے اُسے زندہ رکھنا پڑے گا اور تم یہ نہیں کر سکتے۔ پس دُعا کرنی پڑے گی کہ اے خدا! ہماری رُوحِ عبادت کو زندہ رکھ، اور زندہ رکھنے کی ہمیں توفیق عطا کر۔

پس دو تصوّر اپنے ذہن میں لاؤ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ بڑی عظمت اور جلال والا ہے اور وہ تمام صفاتِ حسنہ سے متصف ہے اور اس کی تمام صفاتِ حسنہ ہر وقت کام کر رہی ہیں کسی وقت بھی معطل نہیں ہوتیں اور خدا تعالیٰ کی جو صفات کام کر رہی ہیں ان کے خلاف جو کوشش اور سعی ہو گی وہ ناکام ہو جائے گی اور دوسرے یہ تصوّر کہ مَیں ذلیل تر اور محض لاشے ہوں جب تک اللہ تعالیٰ کی توفیق اور تائید حاصل نہ ہو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ دو تصوّر اس رُوح کو بیدار کرتے اور زندہ رکھتے ہیں اور جب یہ تصوّر رُوح کو زندہ کر دیتے ہیں تو اس وقت تین خاصیتیں ایسی رُوح میں پیدا ہو جاتی ہیں اور ان خاصیتوں کے پیدا ہونے کے بعد ہی دراصل اس عمارت کی تعمیر کی جا سکتی ہے جس کا تعلق عبادت اور اس کے تقاضوں کے ساتھ ہے۔

دوسرے فرمایا کہ خالی اس قسم کی دعا نہیں بلکہ یہ بھی تسلیم کرو کہ تمہیں جو بھی میسّر آیا ہے، جو بھی ملا ہے مثلاً تمہاری قوّت تمہاری استعدادیں، تمہارا علم، تمہاری طاقت تمہارا جتھہ، تمہارے خاندان اور تمہارا اثر و رسوخ وغیرہ اور تم جس علاقے میں ہو وہاں کی MINERAL RESOURCES یا دوسرے بہت سے اموال جو مختلف ملکوں یا خطوں میں زراعت یا معدنیات وغیرہ کے نتیجہ میں ملتے ہیں، حتّٰی کہ تمہاری زندگی کے سب لمحات یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ فردِ واحد بھی اس کا مخاطب ہے اور قومیں بھی اس کی مخاطب ہیں اور چونکہ یہ سب کچھ اللہ کا ہے، ان کی تقسیم، ان کا مصرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے قائم کردہ حقوق کی روشنی میں ہونا چاہیئے۔ چونکہ ہم تمہیں سونے کی اجازت دیتے ہیں اس لیے سو لیا کرو اور آرام اور راحت حاصل کیا کرو، تا کہ تم اگلے دن تازہ دم ہو کر اپنے کام میں لگو۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑا حق نفس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جو قوتیں اور استعدادیں دی ہیں وہ اپنے دوسرے وسائل اور عطایا اس طرح خرچ کرے کہ یہ قوتیں اور استعدادیں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور فضل کے نتیجہ میں اپنے کمال تک پہنچ جائیں تا کہ انسانی پیدائش کا مقصد پورا ہو۔ ایک مقصد ہے اصولی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔ ایک مقصد ہے انفرادی، جو فرد فرد سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ تمام نفوس جو پیدا کیے گئے وہ قوتوں اور استعدادوں کے لحاظ سے مثلاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر تو نہیں۔ ہر ایک نے اپنی قوت اور استعداد کے مطابق جسمانی اور دنیوی، رُوحانی اور اخروی مسرّتوں اور رفعتوں کے حصول کی کوشش کرنی ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے یہ حقوق قائم کیے اور ہمارے جسم کی بھلائی کے لیے، ہمارے نفس کی بھلائی کے لیے، دنیوی ترقی اور روحانی ترقیات کے لیے ہمیں ہزاروں تعلیمات دی ہیں اور کہا ہے کہ یہ تمہارا حق ہے اگر انسان سوچے اور خدا کا شکر گذار بندہ بنے۔ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ میں تمہیں صرف مصیبتوں میں ڈال کر امتحان لینا چاہتا ہوں،

بلکہ یہ فرمایا ہے کہ تمہارے حقوق بھی قائم کرتا ہوں تاکہ تم ترقی کرو۔ یعنی حقوق ملیں اور اس کا فائدہ بھی تمہیں حاصل ہو، یعنی حق کے ملنے کا وقتی فائدہ بھی اور حق ملنے سے جو شاندار نتیجہ نکلا اس سے ابدی فائدہ بھی حاصل ہو اور یہ کہا کہ تمہارے حق کو قائم کرتا ہوں اور قائم کرنے کے دو فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ انسان کے دل سے یہ خوف نکل گیا کہ خدا کی ساری چیزیں ہیں مَیں کیوں استعمال کروں۔ کیوں کھاؤں، مَیں کیوں پہنوں، مَیں کیوں مکان بنا کر دھوپ اور بارش سے اپنی حفاظت کروں، خدا تعالیٰ نے کہا مَیں تمہارے ان حقوق کو تسلیم کرتا ہوں، تم ان کو پُورا کرو، دوسرے بنیادی طور پر یہ فائدہ ہُوا کہ کسی اور کو یہ حق نہیں پہنچا کہ دخل اندازی کرے یا اعتراض کرے کہ تم کھاتے کیوں ہو، تم پہنتے کیوں ہو، تم اس مکان میں رہتے کیوں ہو، جیسا کہ کسی نے اس بزرگ پر اعتراض کیا تھا تو اُنہوں نے کہا مجھے خدا کہتا ہے مَیں کھاتا ہوں، پس حق قائم ہو گیا دنیا کا اعتراض دُور ہو گیا۔ انسانی نشو و نما اور انتہائی ترقی اور کمال تک پہنچنے کا دروازہ کھل گیا پھر دوسروں کے حقوق بھی قائم کیے ایک حسین معاشرہ قائم ہو گیا۔ ایک ایسا معاشرہ کہ اگر وہ واقعہ میں قائم ہو جائے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد کے زمانہ میں تقریباً تین سو سال تک قائم رہا تو دنیا میں ایک ایسا عظیم انقلاب بپا ہو جائے کہ روس کا انقلاب اس کے مقابلہ میں کوئی حیثیت ہی نہ رکھے۔ اتنی حیثیت بھی نہ رکھے جتنی ہاتھی کے مقابلہ میں ایک مکھی کی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں نے تمہیں اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے، اگر تم میری عبادت اور اس کے لوازمات کو پورا کرو گے، اس کے حقوق کو ادا کرو گے، تو اس کے نتیجہ میں تم ایک ایسی قوم بن جاؤ گے ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ جس کے اوپر کوئی ضعف اور تنزّل نہیں آئے گا۔ ہلاکت اور فنا نہیں آئے گی اگر تم ان احکام پر عمل کرو جو اِن دو چھوٹی سی مختصر آیات میں بیان ہوئے ہیں تو ایک قائم رہنے والی اور دنیا کے مربّی اور استاد بننے والی قوم بن جائے گی۔

اگر ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہی معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی پاک صحبت میں اور بعد میں آنے والوں نے دو صدیوں تک (یعنی پہلی صدی کے بعد آنے والی دو صدیوں میں) آپ کی قوتِ قدسیہ اور آپ کے صحابہ سے فیض حاصل کرنے کے بعد ثابت قدمی کا سبق بھی سیکھا۔ انہوں نے روحِ عبادت کو بھی حاصل کیا، انہوں نے زکوٰۃ یعنی روحِ خدمت کو بھی پایا اور اس طرح پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ان تمام حقوق کو ادا کیا اور اس رنگ میں ادا کیا جس رنگ میں کہ خدا تعالیٰ چاہتا تھا کہ وہ ان حقوق کو ادا کریں خواہ وہ حقوق ان کے نفسوں سے تعلق رکھتے تھے خواہ وہ حقوق ان کے بیوی بچوں سے تعلق رکھتے تھے۔ خواہ وہ حقوق ان کے والدین اور اقربا سے تعلق رکھتے تھے، خواہ وہ حقوق ان کے ہمسایوں یا اہلِ محلہ یا شہر میں بسنے والوں سے تعلق رکھتے تھے یا ان کی دنیا میں بسنے والوں سے تعلق رکھتے تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دنیا کے

محسن بنے، دنیا کے مربی بنے، دنیا کے استاد بنے، خدا کا قرب پانے والے اور اس کے حصول کی راہیں دکھانے والے بنے، قُرب کے حصول کے سامان پیدا کرنے والے بنے، چنانچہ متعصب دشمن بھی اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے کہ واقعہ میں وہ دنیا کے محسنِ اعظم تھے۔

سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ کیوں اور کیسے ایسے بنے؟ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اس لیے بنے کہ مَیں نے قرآنِ کریم میں جو ہدایتیں دی تھیں ان پر انہوں نے عمل کیا۔ تکبّر اور خود ستائی، خود رائی اور خود نمائی ان میں نہیں تھی انہوں نے خدا میں ہو کر ایک نئی زندگی پائی تھی۔ کیونکہ اپنے اوپر انہوں نے ایک موت وارد کر لی تھی۔ وہ اس حقیقت پر قائم ہو چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی محبّت کے حصول کے بغیر اس دنیا میں بھی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی اور وہ اس حقیقت کو بھی پہچانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ اِنسان کے جو حقوق اس دنیا میں قائم کیے ہیں اگر کوئی قوم ان حقوق کی ادائیگی میں سستی اور غفلت سے کام لے تو کبھی کامیاب نہیں رہ سکتی۔ چونکہ انہوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا وہ اس انعام کے وارث بنے اور یہ بڑا زبردست انعام ہے جس کا وعدہ دیا گیا ہے کہ ذَالِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ یہ قائم رہنے والی جماعت، یہ تنزل کے طوفانوں سے محفوظ رہنے والی جماعت کا دین ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے جو دین کہ ثباتِ قدم اور صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی بنیادوں پر کھڑا کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ توفیق عطا کرے کہ ہم اس کے حکموں کو سمجھنے لگیں اور اس کی عبادت اس رنگ میں کریں جس رنگ میں وہ ہم سے چاہتا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں اور اس کے سچّے اور پکّے اور کامل اور حقیقی بندے بن جائیں اور ہمارا اپنا کچھ بھی باقی نہ رہے ہم اس کی خاطر، اسی کے حکم سے، اس میں محو ہو کر فنا اور موت کو اپنے اوپر وارد کریں اور اس سے ایک نئی زندگی جو پیار کی زندگی، جو محبّت کی زندگی، جو احسان کی زندگی ہو اسے حاصل کریں اور خدا کرے کہ زکوٰۃ کے ادا کرنے میں جو بنیادی تعلیم ہمیں دی گئی ہے کہ ہر شے کا مالک اللہ ہے اور اس کا انفاق اور خرچ اس کے حکم اور حق کے قیام کے بغیر نہیں کیا جا سکتا اس حقیقت کو ہم سمجھنے لگیں اور اس کے نتیجہ میں ہر اس شخص کو جس کا حق خدا نے قائم کیا ہے ہم اس کا حق ادا کرنے لگیں تا کوئی کدورت، کوئی بے چینی، کوئی نفرت کوئی بغاوت اس دنیا میں قائم نہ رہے اور سب ایک برادری کی حیثیت میں اپنے ربّ کے قدموں میں اکٹھے ہو جائیں اور ہم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو حاصل کرنے والے ہوں اور یہ دنیا بھی ہمارے لیے جنت بنے اور اس دنیا کے بعد کی جو زندگی ہے اس کے لیے بھی اللہ تعالیٰ جنت کے سامان پیدا کرے۔

(الفضل ۹ وفا ۱۳۴۸ ہش / جولائی ۱۹۶۹ء)

اِسلام کا اقتصادی نظام

خطبہ جمعہ فرمودہ ۳۰ ہجرت (مئی) ۱۳۴۸ ہش / ۱۹۶۹ء

"جو اقتصادی نظام اسلام دنیا کے سامنے رکھ رہا ہے، دنیا کا کوئی اور اقتصادی نظام نفع رسانی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا. ویسے اس نظام کے ماننے والے اپنے دل کی خواہشات کے مطابق اس کی خوبیاں بیان کرتے رہیں تو اور بات ہے، لیکن ٹھوس دلائل کے ساتھ کوئی نظام اس بات کو ثابت نہیں کر سکتا، کہ اس نے انسانیت کے حقوق کی اس طرح حفاظت کی ہے جس طرح اسلام نے تمام انسانوں کے حقوق کی مکمل حفاظت کی ہے"

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

تشہد و تعوذ اور سورہ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے مندرجہ ذیل آیات قرآنیہ کی تلاوت فرمائی:۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ
وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝

(البيّنة آيت ٦)

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ
بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝

(الزخرف آيت ٣٣)

اِس کے بعد فرمایا:۔

کل مجھے فم معدہ کی سوزش کی وجہ سے بہت تکلیف رہی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے آج کافی افاقہ ہے. مگر طبیعت کی علالت اور گرمی کی شدّت مختصر خطبہ چاہتی ہے. مَیں کوشش کروں گا کہ اختصار کے ساتھ اپنے چند پچھلے خطبات کے سلسلہ مضمون کو بیان کروں جو بیچ میں رہ گیا تھا ان خطبات میں مَیں نے بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی خالص اور حقیقی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور سچی پرستش گیارہ تقاضے انسان سے کرتی ہے. جو آیت مَیں نے اپنے اس مضمون کی بنیاد بنائی تھی اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد ہوں، اللہ تعالیٰ کی عبادت کے یہ تقاضے پورے ہونے چاہئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ہر حرکت و سکون اور انسان کے ہر عمل اور انسان کے ہر شعبہ زندگی کے ساتھ ان تقاضوں کا تعلق ہے. حقوق اللہ اور حقوق العباد جیسا کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے ادا نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان کی ادائیگی میں ان گیارہ تقاضوں کا خیال نہ رکھا جائے اور جب تک ان

ہیں یہ گیارہ خصوصیات نہ پائی جائیں۔

آج مَیں ایک شعبہ زندگی کو لیکر کچھ بیان کرنا چاہتا ہوں اور وہ انسان انسان کے اقتصادی تعلقات ہیں۔ سورہ زخرف کی جو آیت مَیں نے آج تلاوت کی ہے اس میں جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے بڑی وضاحت سے اس پر روشنی ڈالی ہے یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ صحیح اور نفع رساں اقتصادی نظام صرف وہ نظام ہے جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے۔ اس آیہ شریفہ سے پہلے منکرینِ اسلام یا یوں کہنا چاہیئے کہ کفّار مکّہ یا اس وقت وہاں جو قوم کے سردار تھے ان کا یہ اعتراض بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو مکہ اور طائف کے بڑے بڑے رؤسا میں سے کسی ایک پر کیوں نہ اُتارا تاکہ وہ اپنی دنیوی وجاہت اور دولت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے پیغام کو زیادہ اچھی طرح سُنا سکتا اور ہم لوگ (یعنی کفار مکہ اور اعتراض کرنے والے) اس کی بات کی طرف زیادہ کان دھرتے بجائے اس کے کہ ایک یتیم اور بے کس اور بے ہنر اُمّیؐ کو منتخب کیا اور اس پر قرآن کریم کو نازل کر دیا۔ وہ قرآن کریم جس کے متعلق دعویٰ یہ ہے کہ وہ ایک عظیم کتاب ہے عظیم کتاب کو ایک عظیم انسان پر اُترنا چاہیئے تھا۔ یہ جاہلانہ اعتراض پیش ہوا تو اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک اصولی صداقت کو بیان کیا جس میں اس اعتراض کا جواب بھی آجاتا ہے اور ایک بنیادی اور اصولی صداقت پر بحث بھی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن کریم کا نزول اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین اور افضل الرسل بنا کر دنیا کی طرف مبعوث کرنا جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ کرنا کہ وہ اپنی صفات کی بہترین تجلیات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ظاہر کریگا یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نتیجہ میں ہے۔ یہ کسی انسان اور خصوصاً اس زمانہ کے انسان کا حق نہیں تھا۔ جو گمراہی اور ضلالت اور فساد میں اپنی انتہا کو پہنچا ہُوا تھا۔ خدا تعالیٰ کی رحمت بندہ کے ظلم اور فساد کو دیکھ کر جوش میں آئی اور اس نے یہ جلوہ دکھایا جو حسین تر اور اعلیٰ تر اور ارفع تر تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے لیے منتخب کیا اور اپنے حسن کا پورا جلوہ آپ پر چڑھا دیا اور اپنے احسان کی پوری قوّت اپنی ظلّیت میں آپ کے اندر ودیعت کر دی اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام بنی نوعِ انسان کی طرف ایک کامل انسان اور ایک محسنِ اعظم کی حیثیت میں مبعوث کیا رحمت کا یہ جلوہ اتنا عظیم تھا کہ ایسا جلوہ انسان نے نہ کبھی دیکھا اور نہ دیکھے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں نے اپنی رحمت کا ایک عظیم جلوہ تم پر ظاہر کیا اور تم یہ اعتراض کرتے ہو کہ رحمت کا یہ جلوہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے جو تمہاری نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا کیوں ظاہر ہوا ہے۔ کسی بڑے رئیس کے ذریعہ سے کیوں ظاہر نہیں ہوا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ اصولی صداقت بیان کی کہ اَھُمْ یَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ۔ کیا قسّام ازل کی رحمتوں کی تقسیم وہ کر سکتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک انسان اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو آگے تقسیم کرے۔ یہ انسان کے اختیار میں نہیں۔

کیا وہ دیکھتے نہیں کہ روحانی دنیا کے ساتھ تعلق رکھنے والی رحمتیں تو ایک طرف رہیں وہ رحمتیں جن کا تعلق اس دنیوی زندگی کی معیشت کے سامانوں کے ساتھ ہے ان کی تقسیم بھی وہ نہیں کر سکتے۔ وہ تقسیم بھی اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے اور جس رنگ میں اُس نے ان کو تقسیم کیا ہے ایک معمولی عقل والے انسان کو بھی نظر آتا ہے کہ وہ مجموعی طور پر انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ اور وہ تقسیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ دنیوی معیشت اور دنیوی زندگی کے سامانوں کی تقسیم ہم نے اس رنگ میں کی ہے کہ ہم نے ہر انسان کی قوت اور استعداد مختلف بنا دی ہے۔ ہر طبیعت کا میلان ہم نے مختلف بنا دیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ایک انسان کو بوجھ اُٹھانے کی طاقت عطا کی ہے قادیان میں ایک سکھ مزدور تھا وہ اتنی طاقت رکھتا تھا کہ پانچ چھ من بوجھ اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا تھا اور دوسروں سے دوگنی تگنی مزدوری لیا کرتا تھا۔ اب اسے یہ طاقت ملا وامل یا کسی زید بکر نے نہیں دی تھی اُسے یہ طاقت اللہ تعالیٰ ہی نے دی تھی پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے قوت اور استعداد اپنی مرضی سے جتنی چاہی ہے کسی کو دی ہے اور یہ چیز ایسی ہے جو انسان کے اختیار سے باہر ہے، یعنی قوت اور استعداد کی تقسیم کفار مکہ کے ہاتھ میں نہیں اور نہ کسی اور انسان کے ہاتھ میں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان قوتوں کے نتیجہ میں اقتصادی تفاوت پیدا ہو گیا۔ ایک کو اللہ تعالیٰ نے بڑی زبردست انتظامی قوت دی اور تجارتی سوجھ بوجھ عطا کی اس نے کروڑوں روپیہ کی ایک انڈسٹری کو منظم کر لیا اور اس طرح کروڑ پتی بن گیا اس کے مقابلہ میں ایک مزدور ہے جو چھ من یا سات من بوجھ اٹھاتا ہے وہ گو دوسروں سے زیادہ اجرت لے رہا ہوتا ہے لیکن بہر حال پہلے شخص کی طرح اس کے پاس زیادہ دولت نہیں ہوتی۔ جب وہ بیمار ہو جاتا ہے تو اس کے پاس علاج معالجہ کے لیے کوئی پیسہ نہیں ہوتا۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری تقسیم کی اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہم نے حقوق کو قائم کیا ہے جب ایک بندہ جس کے پاس زیادہ دولت نہیں بیمار ہو جاتا ہے تو ہم خود اس کے ذمہ دار بن جاتے ہیں۔ ہم اس کے علاج اور دواؤں کا انتظام کرتے ہیں۔ ہم نے اقتصادی نظام ہی ایسا بنا دیا ہے کہ دنیا میں اس قسم کا انتظام ہوتا رہے۔

پھر چونکہ اقتصادی نظام کے نتیجہ میں دنیوی سامانوں یا پیداوار کی تقسیم مشتبہ ہو سکتی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ قوت اور استعداد دونوں کو شامل کر کے انسان کو کہا کہ ان چیزوں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالو پھر تم اس نتیجہ پر پہنچو گے کہ تمہارے اختیار میں یہ بات نہیں کہ تم کسی کو جتنی چاہو طاقت قوت اور استعداد دے دو اور اس کے نتیجہ میں معاشی زندگی میں اور اقتصادی لحاظ سے تفاوت پیدا ہو جائے جس کے دور کرنے کا پھر تم سامان کرو۔ غرض اللہ نے فرمایا ہے دیکھو ہم نے بعض کو بعض قوتیں دی ہیں اور بعض دوسرے انسانوں کو کچھ اور قوّتیں دی ہیں۔ کسی کی طبیعت میں کوئی ہنر رکھ دیا ہے اور کسی کی فطرت میں ایک دوسرا میلان پیدا کر دیا ہے۔ اور جب اس

بات کا نتیجہ نکلتا ہے تو ہمیں نظر آتا ہے کہ کوئی تو دولت مند ہو گیا اور کوئی درویش فقیر اور نادار بن گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ سارا انتظام اس لیے نہیں ہے کہ تم میں سے بعض بعض کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا۔ بلکہ اس چیز سے ہم منع کرتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا۔ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ (الحجرات آیت ۱۲) یہ تفاوت ہم نے اس لیے رکھا ہے کہ بعض بعض کے لیے کاربرار اور خادم بن جائیں۔ کسی کو ایک خاص قسم کی قوت اور استعداد دینا اور دوسرے کو وہ قوت اور استعداد نہ دینا بلکہ اس کی بجائے کوئی اور قوت اور استعداد دینا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اللہ تعالیٰ بعض کو معزز اور بعض کو حقیر بنانا چاہتا ہے، بلکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس نے انسان کو باہمی معاشرہ میں تمدنی زندگی گذارنے والی مخلوق بنایا۔ اس کی راہ میں آسانی پیدا کرنے کے لیے اور ہر ایک کو دوسرے کا خادم بنانے کے لیے اُس نے یہ انتظام کیا کہ اس نے مختلف قوتوں اور مختلف استعدادوں کے ساتھ اس کو پیدا کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صرف ایک پر ہی سارا بوجھ نہیں پڑتا۔ فرد واحد کو تو چھوڑو اگر ایک خاندان کو بھی اپنے سارے کام خود کرنے پڑتے تو دنیا ایک عذاب بن جاتی۔ اس خاندان کے افراد مثلاً خود روئی اُگاتے، خود چنائی کرتے خود ہی کاتتے اور خود ہی اس کا کپڑا بناتے تا وہ اپنا ننگ ڈھانک سکیں۔ پھر دوسری مختلف اجناس ہیں وہ اجناس بھی وہ خود اُگاتے۔ مثلاً وہ خود گندم اگاتے پھر اس کے لیے محنت کرتے، پھر خود ہی اس کو کاٹتے۔ خود ہی گہائی کرتے، خود ہی اُڑاتے اور پھر خود ہی گھر میں دانے لاتے، انہیں صاف کرتے پھر ان کو خود ہی چکی سے پیستے، پھر آٹا گوندھتے اور اس سے روٹی بناتے۔ اس طرح کی ہماری سینکڑوں ضرورتیں ہیں کچھ تو ان میں سے جائز ضرورتیں ہیں اور کچھ ہمیں عادتیں پڑی ہوئی ہیں اور وہ عادتیں ہمارے لیے ضرورت کی شکل اختیار کر جاتی ہیں۔ سینکڑوں کام ہیں جو دوسرے لوگ ہمارے لیے کر رہے ہیں۔ کپڑے کی ضروریات ہیں۔ مثلاً پگڑی کے لیے ململ چاہیئے کھدر کی پگڑی پہنیں تو میرے جیسے آدمی کو سارا دن سردردہی ہوتی رہے۔ بہت کم لوگ اس کے وزن کو برداشت کر سکیں۔ پھر عورت کا اپنا مزاج ہے اور مرد کا اپنا مزاج ہے۔ پھر رنگ ہیں گھر کی ایک لڑکی ایک رنگ کو پسند کرتی ہے تو دوسری لڑکی دوسرے رنگ کو پسند کرتی ہے۔ غرض ہزار قسم کے کام ہیں۔ اگر کسی خاندان کے افراد کو وہ سب کام خود ہی کرنے پڑتے تو یہ دنیا انسان کے لیے جہنم بن جاتی۔

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں نے تمہیں تمہارے آرام کے لیے مختلف قوتیں اور مختلف استعدادیں دی ہیں تا تم ایک دوسرے کے خادم بنو، ایک دوسرے کے کاربرار بنو اور ایک کے اوپر ہی سارا بوجھ نہ آپڑے اور اس طرح پر بنی آدم کی مہمات اور اس کے روحانی اور جسمانی کاموں میں آسانی پیدا ہو جائے۔ مثلاً روحانی کام یہ ہیں کہ انسان رات کو اُٹھ کر عبادت کرتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اندھیرے میں نماز نہیں پڑھنی چاہیئے۔ اب چاہے دِیا ہی ہو یا بجلی کی روشنی اس میں بہرحال دوسروں کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم

ان باتوں کی حکمت اور فلسفہ کو سمجھتے نہیں اور جس غرض کے لیے یہ تمام کارخانہ مختلف قوتوں اور استعدادوں کا بنایا گیا ہے اس کے نتیجہ میں تم اپنے آپ کو خادم سمجھنے کی بجائے آقا سمجھنے لگ جاتے ہو اور ایک دوسرے کو حقارت اور استہزاء سے دیکھنے لگ جاتے ہو۔ لیکن ہم تم کو یہ بتاتے ہیں کہ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ۔ اس میں بڑے لطیف پیرایہ میں اسلام کے اقتصادی نظام کی فوقیت دوسرے تمام اقتصادی نظاموں پر ظاہر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو ظالمانہ اور مفسدانہ نظامِ معیشت اور اقتصادیات تم اپنے سرمایہ یا وحشیانہ قوت سے دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہو اس کی نسبت رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ تمہارے ربّ کی رحمت بہتر ہے۔ اس آیت سے پہلے قرآن کریم کا ذکر آیا ہے جس کی وجہ سے اعتراض ہوا تھا۔ اسی کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اور رَحْمَتُ رَبِّكَ سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم اس کی تعلیم اور ہدایت زیادہ تر نفع رساں ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی جو تفسیر فرمائی ہے مَیں اس وقت اپنے الفاظ میں وہ تفسیر بیان کرونگا۔ تفسیر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ہے، الفاظ میرے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ

۱۔ انسان کی فطرت اور طبیعت میں ہے کہ وہ مِل جُل کے زندگی گذارے اور ایک دوسرے کی مدد اور معاونت کے بغیر اس کا کوئی کام انجام پذیر نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ مَیں نے ابھی مختصراً اشارہ کیا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کی مدد اور ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت ہے۔

۲۔ اگر ہمیں ایک دوسرے کی مدد، معاونت اور تعاون کی ضرورت ہے تو اس کے نتیجہ میں یقیناً ہمیں ایک دوسرے سے معاملہ کرنا پڑے گا۔

۳۔ اور جب ہم ایک دوسرے سے معاملہ کریں گے تو پھر معاوضہ کا سوال پیدا ہو جائے گا۔ اگر کسی کا وقت لیا ہے تو یہ سوال پیدا ہو گا کہ اس کو اُجرت کتنی دینی ہے اور اگر اس کی مثلاً کپڑا بننے کی استعداد نے ہماری مدد کی ہے تو یہ سوال پیدا ہو گا کہ اس کی قیمت کیا دینی ہے۔ غرض معاونت کے نتیجہ میں معاوضہ کی ادائیگی کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔

۴۔ اب یہ ایک اقتصادی سوال ہے لیکن دنیا دار دنیا میں غرق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے غافل ہوتا ہے اس لیے یہ خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر اس معاوضہ کی ادائیگی کو انسان پر ہی چھوڑ اجائے تو حقوق تلف ہو جائیں گے۔ اور یہ خطرہ معمولی نہیں بلکہ بڑا بھاری خطرہ ہے۔ چونکہ انسان اکثر غفلت کے پردوں میں اپنی زندگی کے دن گذارتا ہے اور خدا تعالیٰ کے قرب کی راہوں کو تلاش کرنے کے لیے کوشش نہیں کرتا اس لیے انسان کی عقل اور اس کی قوت منتظمہ پر اس معاملہ کو چھوڑنے کے نتیجہ میں ایک بھاری خطرہ پیدا ہو جائے گا کہ بہت سوں کے حقوق تلف ہو جائیں گے۔ ان حقوق کو تلف ہونے سے بچانے کے لیے ایک ایسے منصفانہ قانون کی ضرورت ہے جو حق و صداقت پر قائم ہونے کی وجہ سے انسان کو ظلم اور تعدی اور بغض اور فساد اور غفلت من اللہ سے روکتا رہے تا انسانی معاشرہ اور نظام اقتصادیات

میں ابتری اور فساد واقع نہ ہو۔ پس چونکہ حقوق کے تلف ہونے کا خطرہ تھا اس لیے اس خطرہ کو دور کرنے کے لیے ہماری عقل بھی یہ کہتی ہے کہ ایک ایسا قانون ہونا چاہیئے جو انصاف اور حق و صداقت پر قائم ہو اور انسان کو ظلم کی راہیں اختیار کرنے اور تعدی کی راہیں اختیار کرنے، بغض و فساد کی راہیں اختیار کرنے اور اللہ تعالیٰ سے دور لے جانے والی راہوں کو اختیار کرنے سے روکے اس کے بغیر صحیح اور ہر ایک کی تسلی کرنے والا نظام زندگی یا نظام اقتصادیات قائم نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ معاش اور نظام زندگی اور معاد اور فلاح اخروی کا تمام مدار انصاف اور خداشناسی پر ہے۔ دونوں چیزوں کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ اکٹھا رکھتا ہے۔ یعنی حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں اکٹھے ہی رکھے گئے ہیں کیونکہ اصل غرض حقوق اللہ کی ادائیگی سے اللہ کو راضی کرنا ہے اور اس کی ایک راہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جو حقوق قائم کیے ہیں ان حقوق کو ادا کیا جائے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کیا جائے غرض (۱) اس دنیوی زندگی، دنیوی حیات کا نظام اور (۲) اُخروی مسرتوں کا حصول اور اُخروی فلاح ہر دو کا مدار حق و انصاف اور خداشناسی پر ہے جب تک معرفت نہ ہو اور جب تک اس معرفت کے نتیجہ میں نظام حیات کو صحیح اور منصفانہ اصول پر قائم نہ کیا جائے اس وقت تک نہ اُخروی زندگی کی خوشیاں حاصل ہوسکتی ہیں اور نہ یہ دنیا جنت بن سکتی ہے۔ یہاں بھی عذاب اور دکھ اور رنج اور تکلیف ہوگی اور وہاں بھی اللہ ہی حافظ ہے۔

۶۔ اس لیے انصاف اور خداترسی کو مضبوطی سے قائم کرنے کے لیے ایسا قانون چاہیئے جو عدل و انصاف کی باریک راہیں بتلاتا ہو اور عرفان و معرفت الٰہی کے حقائق پوری صحت اور وضاحت سے بیان کرتا ہو۔

۷۔ اس قانون کا بنانے والا وہ ہونا چاہیئے جو سہو و خطا اور ظلم و تعدّی سے بالکل پاک ہو اور جو اپنی ذات میں صاحب عظمت اور صاحب عزت و احترام ہو، تا کہ اس کی عظمت اور عزت کی وجہ سے ایک عقل مند انسان بڑی بشاشت سے اس قانون کو قبول کرے۔ غرض یہ قانون ایسا ہونا چاہیئے جو عدل کے تمام تقاضے، جو انصاف کے تمام تقاضے، جو حقوق اللہ کی ادائیگی کے تمام تقاضے اور جو حقوق العباد کی ادائیگی کے تمام تقاضے پورے کرنے والا ہو اور پھر بنا بھی اس ہستی کی طرف سے ہو جو انسان کی نگاہ میں سہو و خطا اور ظلم و تعدی سے پاک ہو اور اس کی اپنی عزت اور عظمت اور جلال اتنا ہو کہ اس کے نتیجہ میں انسان اس کے بنائے ہوئے قانون کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو۔

۸۔ آٹھویں چیز اس آیت میں جو بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایسی ہستی اللہ تعالیٰ ہی کی ہستی ہے جو تمام عظمتوں کا مالک اور تمام عزتوں کا سرچشمہ ہے۔ جو تمام صفات حسنہ سے متصف اور تمام کمزوریوں اور نقائص سے پاک اور منزہ ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور شریعت ہی انسان کو ایک کامل اور منصفانہ نظام معیشت اور نظام اقتصادیات عطا کرسکتی ہے۔ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ اور دنیوی مال و متاع جمع

کرنے کے لیے جو نظام دنیوی لوگ بناتے ہیں وہ اس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ وہ انسان کو تسلی دلانے والے نہیں ہیں۔ پس رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا اعلان کیا کہ اسلام کا نظام سب دیگر نظاموں سے ارفع اور اعلیٰ ہے جس میں سب انسانوں کے حقوق کی حفاظت کی گئی ہے اور کسی کی بھی حق تلفی نہیں ہوتی اس کے برعکس دنیا کے سب دوسرے نظام ناقص اور انسانی حقوق کی حفاظت سے قاصر اور کسی نہ کسی رنگ میں ظالمانہ اور غیر منصفانہ ہیں۔

ہم مختلف اقتصادی نظاموں پر جب نگاہ ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دنیا میں اصولی طور پر دو قسم کے نظام ہیں ایک نظام وہ ہیں جن کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی ہے اور ایک نظام وہ ہیں جن کی بنیاد لامذہبیت پر رکھی گئی ہے جن نظاموں کی بنیاد بظاہر مذہب پر رکھی گئی ہے وہ بھی ظالمانہ ہیں۔ اس وقت میں کسی مذہب کا نام نہیں لینا چاہتا لیکن ایک مذہب جس کے ماننے والے اس وقت دنیا میں بڑا ہی اثر اور رسوخ رکھتے ہیں اس میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص تیرے مذہب سے تعلق نہیں رکھتا اس کا مال غصب کرنا خواہ وہ کسی ذریعہ سے ہو، کسی حیلہ سے ہو جائز ہے یہ ان کا ایک اقتصادی اصول ہے۔ اقتصادیات میں، پیداوار کے مسائل ہیں کہ چیزیں کس طرح پیدا کی جاسکتی ہیں یا تقسیم پیداوار کے مسائل ہیں کہ آگے ان چیزوں کو کس طرح سب میں تقسیم کرنا چاہیئے اس مذکورہ مذہب کے اقتصادی نظام کی بنیاد اس بات پر ہے کہ جو تیرے مذہب کو مانتا نہیں اس کا مال کھانا جائز ہے۔ اسی طرح بعض دوسرے مذاہب ہیں وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ اور شرمندگی کے یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے مذہب کا یہ اصول ہے کہ جس شخص کا ہمارے مذہب کے ساتھ تعلق نہیں یا جس شخص کا ہمارے مذہب کے اس حصہ سے تعلق ہے جو ہمارے نزدیک بڑا ذلیل اور حقیر ہے اور باوجودیکہ اس کا تعلق ہمارے مذہب کے ساتھ ہے ہمارے مذہب نے اس کے کوئی حقوق تسلیم نہیں کیے، ان کا مال کھالینا جائز ہے۔ غرض اقتصادی نظام کی بنیاد اسلام سے باہر چاہے مذہب پر ہو تب بھی ہمیں ظالمانہ نظر آتی ہے۔ کم از کم وہ ایسی نظر نہیں آتی جو تمام انسانوں کے اقتصادی حقوق کی حفاظت کرنیوالی ہو۔

دوسری قسم کا اقتصادی نظام ہمیں وہ نظر آتا ہے جو لامذہبیت کی بنیاد پر قائم ہے اور اس کی دو نمایاں شکلیں ہمارے سامنے ہیں ایک کو ہم سرمایہ داری کا نام دیتے ہیں اور ایک کو ہم اشتراکیت کا نام دیتے ہیں۔ یہ دونوں اقتصادی نظام لامذہبیت کی بنیادوں پر قائم ہیں یعنی ان کا یہ دعویٰ نہیں کہ ان اصول کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے ماتحت دنیا میں رائج کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا اس سے کیا تعلق۔ ہم کماتے ہیں اور پیدا کرتے ہیں، ہم جس طرح چاہیں پیداوار کو آگے تقسیم کریں "اور جس طرح چاہیں" کی آگے جو شکلیں نکلتی ہیں وہ سب ظالمانہ ہوتی ہیں۔

اب دیکھو اللہ تعالیٰ نے ایک فقرہ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ میں بڑی وضاحت سے یہ اعلان کیا کہ جو اقتصادی نظام اسلام دنیا کے سامنے رکھ رہا ہے دنیا کا کوئی اور اقتصادی نظام نفع رسانی میں اس کا مقابلہ

نہیں کر سکتا۔ ویسے اس نظام کے ماننے والے اپنے دل کی خواہشات کے مطابق اس کی خوبیاں بیان کرتے رہیں تو اور بات ہے لیکن ٹھوس دلائل کے ساتھ کوئی نظام اس بات کو ثابت نہیں کر سکتا کہ اس نے انسانیت کے حقوق کی اسی طرح حفاظت کی ہے جس طرح اسلام نے تمام انسانوں کے حقوق کی مکمل حفاظت کی ہے۔

پس صرف یہ بات نہیں کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا اقتصادی نظام بہترین ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے ببانگِ دہل یہ اعلان کیا ہے کہ جو نظام قرآن کریم کو نازل کرنے والے خدا کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا کی طرف آیا ہے وہی انسان کے لیے اقتصادیات کا بہترین نظام ہے اور وہ تمام انسانوں کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے کسی کی حق تلفی نہیں ہونے دیتا اور اسلام کا یہ دعویٰ اس لیے ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام عبادت کے ان گیارہ تقاضوں کو پورا کرنے والا ہے جن کی طرف مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

آج تو تمہید ہی بیان ہو سکی ہے آگے میں بیان کرونگا انشاءاللہ کہ اسلام کا اقتصادی نظام عبادت کے گیارہ تقاضوں کو کس طرح پورا کرتا ہے اور اگر کسی تقاضا کے متعلق کوئی بنیادی بات نظر آتی ہے تو قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ منکرِ اسلام جو کام کرتا ہے، جو دعویٰ کرتا ہے، جو اعلان کرتا ہے، جو بات کرتا ہے وہ حقیقی عبادت کی خصوصیتوں اور اس کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ اس لیے وہ اسلام کے اقتصادی نظام کے مقابلہ میں ٹھہر نہیں سکتا۔

(الفضل ۱۶ وفا ۱۳۴۸ ہش / جولائی ۱۹۶۹ء)

ہر فرد کی قوّت اور استعداد

کو

کمال تک پہنچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ

جس چیز کی ضرورت ہے

وہ میسّر ہونی چاہیئے

خطبہ جمعہ فرمودہ ۶ احسان ۱۳۴۸ ہش / جون ۱۹۶۹ء

’اسلام کا اقتصادی نظام ایک ایسا نظام ہے جس میں ہر فرد بشر کو ہر وہ چیز میسّر آجاتی ہے جو اس کی قوتوں اور استعدادوں کے صحیح نشوونما کے لیے اور انہیں کمال تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے اور اس طرح اس کا حق مارا نہیں جاتا۔ اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ قوتوں کی غلط نشوونما کے لیے جس جس چیز کا انسانی ذہن یا اس کا معاشرہ مطالبہ کرتا ہے اسلام کے اقتصادی نظام میں وہ اسے میسّر نہیں آئے گی، کیونکہ وہ چیز اس کے لیے پیدا ہی نہیں کی گئی، وہ اس کا حق ہی نہیں بنتا۔ اس غرض کے لیے وہ قوت یا وہ چیز پیدا نہیں کی گئی“

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

تشہد و تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:۔

مَیں نے پچھلے خطبہ میں بتایا تھا کہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ جو اقتصادی نظام وہ دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے وہی ارفع اور برتر نظام ہے اور یہ اس لیے کہ اسلام کا اقتصادی نظام عبادت کے اُن تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے جن کی طرف ہمیں اسلامی تعلیم متوجہ کرتی ہے۔

اگر ہم زیادہ تفصیل سے غور کریں اور اس مضمون پر سوچیں کہ عبادت کے سارے تقاضوں کا اسلام کے اقتصادی نظام سے کیا تعلق ہے تو ایک عظیم مضمون ہمارے سامنے آتا ہے۔

مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ میں عبادت کے جس پہلے تقاضا کی طرف اشارہ کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ عبادت اور پرستش سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کی نہیں کرنی، جس کے معنے اسلامی تعلیم کی رو سے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات میں ہر ایک شریک سے منزّہ سمجھنا۔ دنیا کی تاریخ اور دنیا کے حالات پر نظر رکھتے ہوئے اس کے معنے یہ ہونگے کہ کسی بُت کو خدا کا شریک نہیں ٹھہرانا، کسی انسان کو خدا کا شریک نہیں بنانا، چاند اور سورج اور پیپل وغیرہ کے درختوں اور سانپوں اور پتھروں کو بھی خدا کا شریک نہیں بنانا۔ نہ ہی اپنے نفس، اپنی تدبیر اور اپنے مکر و فریب کو خدا تعالیٰ کا شریک بنانا ہے۔

اس کے دوسرے معنے یہ ہیں کہ ربوبیت اور الوہیت کی صفات کو خالصۃً لِلّٰہ قرار دینا یعنی ان صفات کو بجز ذات باری کسی اور میں قرار نہ دینا اور بظاہر جو ربوبیت کرنے والے ربّ اور فیض پہنچانے والے وجود ہیں انہیں بھی حقیقی رب تصوّر نہیں کرنا بلکہ ایسے وجودوں کو جو حقیقتاً ایک حد تک اس اسباب کی دنیا میں دوسروں کو فیض پہنچانے والے اور ان کی ربوبیت کرنے والے ہیں۔ ان سب کو اللہ کے ہاتھ کا ایک نظام یقین کرنا۔ پس نہ ذات باری میں اور نہ صفات باری میں کسی کو شریک قرار دینا اور اس دنیا کو صفات باری کے جلوے ہی سمجھنا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مضمون پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے کہ جو صفاتِ اشیا ہیں وہ آثار صفاتِ باری ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں، ہر چیز کے اندر جو خصوصیت، جو صفت، جو اثر پایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی نہ کسی صفت کا جلوہ ہے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی کا نام سنت اللہ یا قانون قدرت رکھا ہے۔

پس نہ ذات باری میں، نہ صفات باری میں کسی دوسرے کو شریک قرار دینا ہے۔ یہ عبادت کا پہلا مطالبہ تھا۔

ویسے اسلام کے ہر حکم میں عبادت کے ان تمام حقیقی تقاضوں کو مدِّنظر رکھا گیا ہے اسلام کا اقتصادی نظام بھی عبادت کے تمام تقاضوں کو مدنظر رکھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کا اقتصادی نظام صفات باری کی بنیادوں پر اس طرح قائم کیا گیا ہے کہ ان صفات حسنہ کا اظہار بھی ہو اور ان میں کسی اور کے شریک ہونے کو برداشت بھی نہ کیا جائے۔ غرض خالصتہً صفات باری پر اسلام کے اقتصادی نظام کی بنیاد ہے۔ مَیں چند مثالیں دے کر اس مضمون کو واضح کروں گا۔

جیسا کہ مَیں نے کہا ہے ساری صفاتِ باری اسلام کے اقتصادی نظام میں جلوہ گر ہیں، لیکن پہلی بڑی صفت جو اس نظام میں ہمیں جلوہ گر نظر آتی ہے جس کے اوپر مَیں سمجھتا ہوں کہ سارے نظام کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ رَبّ العٰلمین کی صفت ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بحیثیت ربّ کے ہر چیز کو پیدا کیا اور ہر شئی اور ہر جاندار کے اندر مختلف قوتیں اور استعدادیں پیدا کیں اور ہر شخص کے اندر ان قوتوں اور استعدادوں کی حدبندی کی۔ پھر یہ کہ ہر قوت اور استعداد کی نشوونما کے سامان پیدا کیے، ہر قوت کے لیے وہ چیز پیدا کر دی کہ جو اسے میسّر آجائے تو وہ قوت اپنے کمال کو پہنچ جائے اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ ساری دنیا انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ دنیا میں جو کچھ بھی ہمیں نظر آتا ہے وہ اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ ہر فردِ بشر کی تمام قوتوں اور استعدادوں کی نشوونما کو اس کے کمال تک پہنچایا جا سکے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کی قوت یا استعداد کو نشوونما تک پہنچانے کے سامان میسّر نہیں تو وہ شخص مظلوم ہے اور اس کا حق مارا گیا ہے کیونکہ اللہ ربّ العالمین نے جو سامان اور جو اسباب اس کی قوتوں اور استعدادوں کی صحیح نشوونما کے لیے اور ان کے کمال تک پہنچانے کے لیے پیدا کیے تھے، وہ اسے حاصل نہیں ہوئے۔

اسلام کا اقتصادی نظام ایک ایسا نظام ہے جس میں ہر فردِ بشر کو ہر وہ چیز میسّر آجاتی ہے جو اس کی قوتوں اور استعدادوں کی صحیح نشوونما کے لیے اور انہیں کمال تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے اور اس طرح اس کا حق مارا نہیں جاتا اس کے یہ معنے بھی ہیں کہ قوتوں کی غلط نشوونما کے لیے جس جس چیز کا انسانی ذہن یا اس کا معاشرہ مطالبہ کرتا ہے اسلام کے اقتصادی نظام میں وہ اسے میسّر نہیں آئے گی کیونکہ وہ چیز اس کے لیے پیدا ہی نہیں کی گئی۔ وہ اس کا حق ہی نہیں بنتا۔ اس غرض کے لیے وہ قوت یا وہ چیز پیدا نہیں کی گئی ہے لیکن اس کی تفصیل میں مَیں بعد میں جاؤں گا۔

غرض اسلام کا اقتصادی نظام یہ نہیں کہتا کہ ضروریاتِ زندگی کے لیے کم سے کم جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ہمیں مہیّا ہونی چاہئیں۔ اسلام کا اقتصادی نظام یہ کہتا ہے کہ ہر فرد کی قوتوں اور استعدادوں کی نشوونما اور انہیں کمال تک پہنچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ اسے میسّر ہونی چاہیئے۔ سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت ہر دو میں اس چیز کا عام طور پر خیال نہیں رکھا گیا۔ لیکن اسلام یہ کہتا ہے کہ ان قوتوں اور استعدادوں کی حفاظت کرنے اور انہیں انحطاط سے بچانے کے سامان بھی اللہ نے پیدا کیے ہیں۔ اس لیے ہر وہ چیز جو اس ارتقا کے راستے میں روک ہے

اس نشوونما کے راستے میں روک بنتی ہے اسے دور کرنے کا انتظام بھی اسلام کے پیش کردہ اقتصادی نظام میں موجود ہے۔ مثلاً بعض دفعہ بیماری روک بن جاتی ہے۔ اگرچہ آدمی سنت اللہ کو نظرانداز کرتے ہوئے یا غفلت کی وجہ سے یا بعض دفعہ جان بوجھ کر خدا کے قانون کو توڑتے ہوئے وہ خود بیمار ہوتا ہے اس کے باوجود اس غافل انسان کی صحت کی ذمہ داری اسلام کے اقتصادی نظام نے اپنے ذمہ لی ہے۔ صرف کپڑا اور روٹی اور مکان وغیرہ جو ہیں ان کو ہی "ضرورت" نہیں سمجھا گیا، بلکہ ہر وہ چیز جس کی انسانی قوتوں اور استعدادوں کی حفاظت اور نشوونما اور ان کو کمال تک پہنچانے کے لیے ضرورت ہے اسلام کہتا ہے کہ وہ چیز مہیّا ہونی چاہیئے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ بعض بچے بڑے ذہین ہوتے ہیں (میں ایک ہی مثال دونگا ورنہ یہ مضمون بڑا لمبا ہو جائیگا) اور ان کے ذہنی نشوونما میں گندی سوسائٹی اور گندا ماحول روک بن جاتا ہے۔ اسلام کا نظام (اسے آپ اقتصادی نظام یا معاشرتی نظام کہہ لیں کیونکہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں) یہ کہتا ہے کہ اس کی قوتوں اور استعدادوں کی نشوونما میں بُری صحبت روک بن رہی ہے اس لیے یہ روک دُور کرو۔ اللہ تعالیٰ نے سارے معاشرے کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی نگرانی کرنے والے ہوں۔

چھوٹی جماعتوں میں عام طور پر زیادہ خرچ نہیں ہوتا، ماں باپ اتنا بوجھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن بسا اوقات ایک بچے کو پوری غذا میسّر نہیں آرہی ہوتی، لیکن وہ بڑے اچھے نمبر لیکر دسویں جماعت پاس کر لیتا ہے۔ اس کا دماغی رجحان ڈاکٹر بننے کا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باوجود بچّے کی طبیعت کے اس رجحان کے اکثر والدین اس کو آرٹس کی طرف کیوں لے جاتے ہیں۔ میرے ذاتی علم میں بعض ایسی مثالیں ہیں کہ ماں باپ نے یہ سوچا کہ بچّہ کا رجحان تو میڈیکل لائن اختیار کرنے کا ہے جس کے بعد وہ میڈیکل کالج میں داخل ہو سکتا ہے لیکن اگر سائنس کا مضمون لے تو خرچ زیادہ آئیگا اس لیے اس کو آرٹس کی طرف لے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ظلم ہے، اسے ذہنی طور پر ڈاکٹر بننے کے لیے پیدا کیا گیا تھا اسے وہ تمام سہولتیں میسّر آنی چاہئیں جن کی بناء پر وہ ڈاکٹر بن سکے۔

پھر میں نے کالج میں دیکھا ہے بعض لڑکے بڑے ذہین ہوتے ہیں، بڑے محنتی ہوتے ہیں، لیکن انہیں کھانے پینے کے لیے جو میسّر آتا ہے اس سے وہ اپنی صحت کو برقرار نہیں رکھ سکتے، کمزور ہو جاتے ہیں۔ اسلام کا اقتصادی نظام ہمیں یہ کہتا ہے کہ تمہارا یہ فرض ہے کہ تم دیکھو کہ بچے کو صرف زندہ رہنے کے لیے غذا نہ ملے بلکہ اُسے اس کے ذہنی رجحان کے مطابق غذا دو تا وہ صحت مند ڈاکٹر بنے۔ جس کے لیے دوسرے مضمونوں سے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور اچھے ذہن کو اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے محنت بہرحال زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ اس واسطے دماغی کام جتنا بوجھ اس پر ڈال رہا ہے اُسے اسی قسم کی غذا ملنی چاہیئے۔ ایک شخص مثلاً سارا دن ہل چلاتا ہے وہ اپنی طبیعت اور جسمانی کام کی وجہ سے زیادہ آٹا استعمال کر کے اپنی صحت کو برقرار رکھتا ہے، لیکن کالج کے ایک طالب علم کو جو کلاس کے علاوہ دس پندرہ گھنٹے

کام کر رہا ہو اس کو وہی آٹا دیدیں تو وہ اپنی صحت کو برقرار نہیں رکھ سکتا بلکہ وہ شاید اور زیادہ بیمار ہو جائے۔ کیونکہ اسے اور قسم کی غذا کی ضرورت ہے پس اسلام کا اقتصادی نظام یہ کہتا ہے کہ ایسے طالب علم کو اس کی ضرورت کے مطابق غذا ملنی چاہیئے۔

میں ایک دفعہ اپنے کالج کے دفتر سے گھر کی طرف جا رہا تھا راستے میں مجھے ایک طالب علم ملا جس کے متعلق مجھے علم تھا کہ وہ بڑا محنتی اور ہوشیار طالب علم ہے۔ کوئی مہینے ڈیڑھ تک یونیورسٹی کے امتحان ہونے والے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس کا رنگ زرد اور منہ پر دھبے پڑے ہوئے ہیں بیمار شکل ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا سخت صدمہ پہنچا کہ میں نے اس کی صحت کا خیال نہیں رکھا۔ ویسے وہ عام کھانا تو کھا رہا تھا لیکن ایسے کھانے پر اسلام کا اقتصادی نظام نہیں ٹھہرتا۔ میں نے سوچا کہ میں نے ظلم کیا۔ کشتی رانی کرنے والے طَلَبہ کو تو میں سویابین دیتا ہوں، لیکن جو دن رات محنت کرنے والے طَلَبہ ہیں ان کو میں سویابین نہیں دیتا میں نے تو بڑی غلطی کی چنانچہ اس کو تو میں نے کہا کہ مجھ سے سویابین لے جا کر استعمال کرنا لیکن بعد میں میں نے تمام محنتی، ذہین طَلَبہ کو سویابین دینے کا انتظام کر دیا) پہلے اسے مناسب حال غذا نہیں مل رہی تھی اب جب اُسے مناسب حال غذا ملی تو پندرہ دن کے بعد میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کے دھبے دور ہو گئے۔ چہرے پر سُرخی آگئی، آنکھوں میں زندگی اور توانائی کی علامات نظر آنے لگیں اور وہ امتحان میں بڑی اچھی طرح سے پاس ہوا۔ اچھے نمبر تو وہ ویسے بھی لے لیتا، لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ساری عمر کے لیے وہ بیمار پڑ جاتا کئی ایسے عوارض اسے لاحق ہو جاتے جن سے چھٹکارا پانا اس کے لیے ناممکن ہو جاتا۔

پس اسلام کا اقتصادی نظام صرف یہ نہیں کہتا کہ ایسے طالب علم کو صرف زندہ رکھنا ہے۔ اسلام کا اقتصادی نظام یہ کہتا ہے کہ ایسے طالب علم کی خداداد قوت اور استعداد کی نشوونما کو کمال تک پہنچانے کے لیے جو بھی اس کی ضرورت ہے وہ پوری کرنی ہے پھر آگے جا کر اس کے لیے یہ انتظام بھی ہونا چاہیئے کہ وہ میڈیکل کالج میں داخل بھی ہو سکے۔ پھر یہ انتظام بھی ہونا چاہیئے کہ بعد میں RESEARCH میں اگر اس کا دماغ چلتا ہے تو اس کی انتہا تک پہنچ جائے۔

خدا تعالیٰ نے اس دنیا میں قوموں کے درمیان مقابلے اور مسابقت کی روح پیدا کی ہے۔ ان میں سے بعض مقابلے جائز اور اچھے ہیں بعض بُرے بھی ہیں ان کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیئے، لیکن اچھی باتوں میں ہم نے بہرحال مقابلہ کرنا ہے جب تک یہ انتظام نہ کیا جائے اُس وقت تک ہم ان قوموں سے جو دنیا کے ہر میدان میں اس وقت ہم سے آگے نکلی ہوئی ہیں مقابلہ نہیں کر سکتے، اسلام کے اقتصادی نظام پر عمل پیرا ہو کر ہی ہم اُن سے مقابلہ کر سکتے ہیں، کیونکہ جن بُرائیوں میں وہ پھنسے ہوئے ہیں اسلام کا اقتصادی نظام ہمارے نوجوانوں کو اُن سے محفوظ رکھے گا۔

غرض اسلام کا اقتصادی نظام اس بنیاد پر قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کی قوتوں اور استعدادوں کو بھی پیدا کیا۔ ان قوتوں اور استعدادوں کے مطابق سامان بھی پیدا کیے اور پھر ان کی نشوونما کو کمال تک پہنچانے کے سامان بھی پیدا کیے۔ اسلام کا اقتصادی نظام صفات باری کے پرتو کے نیچے ہر انسان کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کیونکہ ہمارے نزدیک

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور نے تو کوئی چیز پیدا نہیں کی پھر ہمیں یہ بتایا کہ چونکہ ایک طرف ہر ایک کو قوت دی اور اس قوت کی صحیح نشوونما کے لیے ہر قسم کے سامان دیئے تو دوسری طرف مختلف انسانوں کو مختلف قوتیں اور استعدادیں دے کر ایک تفاوت پیدا کر دیا اور یہ تفاوت ابتلا اور امتحان کے لیے پیدا کیا۔ اسلام کے نزدیک کسی کا مالدار ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہے نہ کسی کا غریب ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے ناراض ہے بلکہ ہر دو کو اللہ تعالیٰ نے ایک امتحان اور ابتلا میں ڈالا اگر وہ اس پر پورے اُترے تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بھی اور اُخروی زندگی میں بھی جنت کے سامان پیدا کر دیئے ہر قسم کی رضائے الٰہی کے سامان یعنی اُس دنیا کی زیادہ سے زیادہ نشوونما اور ارتقا اور زیادہ سے زیادہ قرب الٰہی کے حصول کے سامان پیدا کر دیئے۔

اگر یہ تفاوت نہ ہوتا۔ ایک شخص کے اندر انتظامی قابلیت اور تجارتی میلانِ طبع نہ ہوتا، تجارت کی سُوجھ بُوجھ نہ ہوتی تو وہ کروڑپتی نہ بنتا۔ اس کو کہا کہ تُو اپنی قوت کو نشوونما دے اور جائز ذرائع سے جتنا کما سکتا ہے کما۔ جب اس نے کما لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا کہ جو ہم نے تمہیں کمانے کی قوت دی تھی اور تجارت کی سُوجھ بُوجھ عطا کی تھی اس کے نتیجہ میں تم نے پانچ کروڑ روپیہ کما لیا لیکن اب ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ پانچ کروڑ تمہارا نہیں، کیونکہ اس میں سے تین کروڑ روپیہ وہ ہے جس کا تعلق تیرے بھائیوں کے ساتھ ہے۔ وہ اس سے فائدہ حاصل کریں گے۔ اس واسطے ۳/۵ ان کو دیدے۔

تقسیم پیداوار کے جو اصول ہیں وہ اسی بنیاد پر بنائے گئے ہیں کہ ہر انسان کی ضرورت (اس وسیع معنے میں جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے) پوری ہونی چاہیئے۔ جائز ضرورت ہو، اللہ تعالیٰ سے دُور لے جانے والی چیز نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سے بغاوت کے آثار نہ ہوں اس میں خالص اطاعت ہو۔ اور جتنی ضرورتیں ہیں روحانی جسمانی وغیرہ ان کے سامان ہوں (آگے اس کی بڑی لمبی تفصیل ہے) لیکن ہر ضرورت پوری ہونی چاہیئے۔ اگر اس کی قوت اور استعداد ایسی بنائی کہ وہ اس معاشرے کو حسین بنانے میں تو کامیاب ہوا لیکن اپنی اور اپنے بچوں کی اور اپنے DEPENDENTS (زیر کفالت افراد) کی ساری ضرورتوں کو پورا کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو خدا تعالیٰ نے اسے کہا کہ تم گھبراؤ نہیں، یہ تفاوت جو آپس میں رکھا گیا ہے اس کے نتیجہ میں تیری ضرورت کی اشیا ہم نے دوسرے کے گھر میں اس کی قوتوں کی وجہ سے بھیج دی ہیں لیکن اسے یہ حکم دیا ہے کہ وہ تیرے گھر واپس کرے۔ پس اس طرح ایک امن کا معاشرہ قائم ہو جاتا ہے۔

پھر ربّ العالمین کی صفت کے نتیجہ میں جو اقتصادی نظام قائم ہوا اس میں نسل کا یا قوم کا یا مذہب کا کوئی دخل نہیں رکھا گیا کیونکہ ربوبیت عالمین کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مخلوق کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے۔ اس مخلوق میں سے مثلاً کوئی ابوجہل بن جاتا ہے پس اس کی اقتصادی ضرورتیں تو بہرحال پوری ہونی چاہئیں کیونکہ رب العالمین نے اسے پیدا کیا اور اس کی ضرورتوں کو بھی پیدا کیا اور اس کی قوتوں اور طاقتوں کو بھی پیدا کیا وہ اس سے حساب لیگا بعض دفعہ اس دنیا میں بھی لیتا ہے اور بہتوں کا اس دنیا میں حساب نہیں لیتا اُس دنیا میں لے لیتا ہے لیکن ان کے ساتھ جو سلوک ہے (اس وقت میں اقتصادی سلوک کی بات کر رہا ہوں)

وہ ربّ العٰلمین کی صفت کو قائم کرتے ہوئے ہونا چاہیئے۔ ربوبیت عالمین کا جلوہ اس کے اندر نظر آنا چاہیئے۔ ایک شخص اللہ تعالیٰ کو گالیاں دیتا ہے، ایک دوسرا ہے جو بتوں کی پرستش کرتا ہے، ایک دہریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر یہ مجھ سے دُور جا رہا ہے تو خود نقصان اُٹھائیگا مَیں ربّ العٰلمین ہوں اگر تم میرے بندے ہو تو میرے قائم کردہ اقتصادی نظام پر تمہیں عمل کرنا پڑے گا اور وہ یہ ہے کہ جب مَیں نے اس گالیاں دینے والے انسان کو پیدا کیا اس کی قوتوں اور طاقتوں کو بھی مَیں نے ہی پیدا کیا اور ان کی نشو و نما کے تمام جسمانی اسباب بھی مَیں نے پیدا کیے۔ بعض کو اس نے ٹھکرا دیا میری طرف سے اس کو سزا ملے گی۔ لیکن جس قسم کے نشو و نما کے سامان تم پیدا کر سکتے ہو اُن میں روحانی بھی آجاتے ہیں، یعنی اس کو تبلیغ اور وعظ و نصیحت کرنا۔ اخلاقی بھی آجاتے ہیں کہ اس کو سمجھانا کہ یہ چیزیں اخلاق کے لیے بُری ہیں اور جسمانی بھی آجاتے ہیں کہ اس کی ضرورتوں کو پورا کرنا۔ اگر آج ابوجہل کے کسی مثیل کے ہاں یا بُت پرست کے ہاں یا ہندو کے ہاں بچّہ پیدا ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے بہت اچھا ڈاکٹر بننے کی طاقت دی ہو اور اسی قسم کا ایک اور بچہ اعلیٰ قوتوں اور استعدادوں کے ساتھ ایک مسلمان کے گھر پیدا ہو تو اسلام کا اقتصادی نظام یہ کہتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کرنا بلکہ ہر دو کی قوتوں کی نشو و نما کے سامان مہیّا کرنے ہیں۔ اُن سے تعاون کرنا ہے ان کی مدد کرنی ہے اور پوری کوشش کرنی ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو بڑھاتے چلے جائیں اور ممکن ہے اپنی اپنی LINES میں اپنی اپنی شق میں وہ سب سے اچھے اور چوٹی کے ڈاکٹر بن جائیں۔ ایک بُت پرست کا بیٹا ہوگا، ایک خدائے واحد و یگانہ کی پرستش کرنے والے کا بیٹا اور خود بھی توحید باری پر قائم ہوگا لیکن جہاں تک اقتصادی تعلقات کا سوال ہے اسلام یہ کہتا ہے کہ ان تعلقات کو ربّ العٰلمین کی بنیاد پر قائم کیا جائے۔ بعض مذاہب یا بعض فرقے دینے کی بجائے حقوق غصب کرنے کی طرف بھی مائل ہو جاتے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ جو نظام صفت ربوبیت کے جلوے دکھانے کے لیے قائم کیا گیا ہے اس میں یہ بات نہیں برداشت کی جا سکتی کہ چونکہ عقیدہ ہم سے مختلف ہے اس لیے ان کو لوٹ لو۔ غرض دنیا کے خواہ کسی ملک کا رہنے والا ہو۔ کسی بھی مذہب سے اس کا تعلق ہو اللہ تعالیٰ کو مانتا ہو یا نہ مانتا ہو اسلام کا اقتصادی نظام جہاں جاری ہوگا وہاں کوئی تفریق نہیں ہوگی ایک ہی معیار ہوگا۔ اور وہ یہ کہ جتنی طاقت ربّ العٰلمین نے اس کو دی ہے جتنی استعداد اس کو عطا کی گئی ہے اس قوت اور استعداد کی صحیح اور پوری نشو و نما کا سامان ہم نے مہیّا کرنا ہے۔

غرض اسلام کا اقتصادی نظام ان چار بنیادی صفات باری پر قائم ہے ربّ، رحمٰن، رحیم اور مالک یوم الدین لیکن نمایاں ربوبیت عالمین ہے۔ ربوبیتِ عالمین کے ضمن میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ جس کے پاس زائد چلا گیا وہ آگے دوسروں کو کیوں دے؟ دوسرے کا حق کیوں تسلیم کرے؟ اس لیے فرمایا کہ وہ مالک ہے حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے غیر اللہ کسی چیز کا مالک نہیں ہے۔ پس چونکہ وہ مالک ہے اس واسطے مالک نے جو ربّ ہے اپنی مرضی اور علم کامل سے یہ حکم دیا ہے کہ کس کو دو کس کو نہ دو، اور اگر دو تو کتنا دو۔ ایک کروڑپتی خدارسیدہ مسلمان صبح و شام استغفار کرتا ہے

دعائیں کرتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ قرآن کریم نے اس کے مال کی تقسیم کے کون سے راستے بیان کیے ہیں تاکہ مَیں اس کے مطابق تقسیم کروں۔ جتنا حق مجھے دیا ہے وہ حق میں لے لوں اور جو دوسروں کا حق ہے اسے مَیں غصب کرنے والا نہ بنوں پس جو مالک ہے وہی حق قائم کر سکتا ہے یعنی ربّ نے پیدا کیا پھر وہ مالک ہے قوتیں اور استعدادیں بھی اسی کی ملکیت ہیں اور ان کی نشو و نما کے سامان بھی اسی کی ملکیت ہیں اور اس نے بتایا ہے کہ کتنا کسی کو دینا ہے اور ربوبیت عالمین کی وجہ سے یہ اعلان کیا کہ ہر شخص کی ضرورت اس حد تک پوری کرو کہ اس کی نشو و نما میں کوئی نقص پیدا نہ ہو اور اس کی یہ نشو و نما اپنے کمال کو پہنچ جائے پس سوال پیدا ہوتا تھا کہ زید سے لیکر بکر کو دینے کا کیا حق ہے اور کیوں ایسا کیا جائے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک صفت یہ بتائی کہ مَیں مالک ہوں۔ تمہاری ملکیت ہی نہیں۔ جب ہر چیز میری ہے تو جس طرح میں کہوں اسی طرح تمہیں خرچ کرنی چاہیئے اور جو حقوق میں قائم کروں وہی حقوق قائم ہوں گے۔ کسی اور کا حق ہی نہیں کہ وہ حق کو قائم کرے کیونکہ وہ مالک نہیں اسے اختیار ہی نہیں ہے اس کی ملکیت کا دعویٰ ہی غلط ہے۔

حقوق کے قیام میں پھر آگے دو چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں، دراصل یہ اُمّہات الصفات ہی ہیں جن کے گرد سارا اقتصادی نظام چکر لگا رہا ہے۔ ربوبیت اور رحمانیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک تو قوتوں اور استعدادوں کی صحیح نشو و نما کے سامان پیدا کیے اور کسی حق یا محنت کے بغیر اپنی طرف سے دے دیا۔ ابھی انسان پیدا بھی نہیں ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے یہ سامان پیدا کر دیئے اور پیداوار یعنی جو اللہ تعالیٰ نے خَلق کیا ہے اس کو آگے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلا حصّہ رحیمیت کے نتیجہ میں ملتا ہے کہ جتنی مزدوریاں اور اُجرتیں ہیں اور اس کے نتیجہ میں جو حقوق پیدا ہوتے ہیں وہ رحیمیت کے نتیجہ میں ہوتے ہیں یعنی کوئی جو بھی کام کرتا ہے اسے اس کام کا بدلہ ملنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ نے اقتصادی نظام میں بھی کہا ہے کہ جتنا جتنا کسی نے کام کیا اُتنا اُتنا اسے ملنا چاہیئے اور وقت پر ملنا چاہیئے اور ایسے رنگ میں ملنا چاہیئے کہ دینے والے کو یہ خیال نہ ہو کہ گویا میں احسان کر کے دے رہا ہوں اور اس کو ستانے اور تنگ کرنے لگ جائے یہ اس کا حق ہے اسی طرح جس طرح اگر وہ کسی کو قرض دے اور جب واپس لینے آئے تو اگلا کہے کہ دو دو پیسے کر کے لے لیا کرو۔ کچھ لوگ قرض لیکر ایسا کرتے ہیں کہ احسان جتاتے ہیں کہ مَیں نے تم سے پانچ ہزار روپیہ لیا تھا دیکھو مَیں کتنا اچھا اور با اخلاق انسان ہوں مَیں نے تیرے پیسے مارے نہیں ہیں اور وہ واپس کر دیئے ہیں پس بعض لوگ اس طرح بھی کرتے ہیں۔

غرض رحیمیت کے جلوے بھی ہمیں اسلام کے اقتصادی نظام میں نظر آرہے ہیں اور آگے اسلام نے اس کی بڑی تفصیل بتائی ہے کہ مزدور کو وقت پر اور پوری مزدوری دو اور ان دونوں باتوں کو بنیادی طور پر لازمی قرار دیا ہے لیکن چونکہ ربوبیت عالمین کے نتیجہ میں انسانی معاشرہ میں بعض نے امیر بن جانا تھا اور بعض نے غریب اس لیے خالی رحیمیت کے اوپر پیداوار کی تقسیم کو نہیں چھوڑا کہ جتنا کوئی کما لیتا ہے کما لے، بلکہ ساتھ مالکیت کو بھی لگایا ہے کہ اگر اپنی ضرورت سے وہ کم کمائے یعنی اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ اس کے بچّوں وغیرہ یا خاندان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے سوا کائیاں (سولونٹ) درکار ہوں وہ بڑی

محنت کرتا ہے۔ اس کے بچے بھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتے اور ان کا خرچ بھی صحیح ہے لیکن ان کو ساٹھ اکائیاں ملتی ہیں یعنی اس کی ضرورت میں سے ۴۰ فیصد کم رہ جاتا ہے تو ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ مسلمان کو کہتا ہے کہ میں مالک ہونے کی حیثیت سے تمہیں کہتا ہوں کہ اس کے لیے میں نے جو چیز پیدا کی تھی اس میں سے اسے صرف ۶۰ فیصد ملا ہے اسے ۴۰ فیصد ابھی نہیں ملا یہ ۴۰ فیصد اسے مہیا کرو جو تمہیں امانتاً مل چکا ہے۔

پس اسلام کا اقتصادی نظام سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام ہر دو سے بالکل مختلف ہے۔ ایک تو مثلاً یہی کہ جو نظام ربّ العٰلمین کی صفت کے جلوے سمیٹے ہوئے ہے سرمایہ داری کا نظام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، کیونکہ سرمایہ داری کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جن اقوام کو موقعہ ملا انہوں نے دوسری اقوام کو لُوٹا۔ خود امیر بنے دوسروں کے حقوق غصب کیے اور جو اپنے حقوق نہیں تھے وہ سمجھے کہ یہ ہمارے حقوق ہیں اور وہ پورے ہونے چاہئیں۔ افراد ہی کو غریب نہیں کیا قوموں کو بھی غریب کر دیا۔ دوسری طرف اشتراکی نظام ہے اس میں (سرمایہ داری میں بھی بعض خوبیاں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بنیادی حکم دیا ہے کہ جس کی بُرائیاں زیادہ ہوں وہ ترک کر دینے کے قابل ہے) بھی کچھ خوبیاں ہیں لیکن اسلام کے اقتصادی نظام سے یہ اشتراکی نظام بھی مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ اسلام تو ہے ہی خوبی ہی خوبی خیر ہی خیر اور حُسن ہی حُسن۔ اسلام کے اقتصادی نظام پر کوئی بدنما داغ نہیں ہے کیونکہ یہ ہر انسان کے حقوق بشمولیت اقتصادی حقوق کی حفاظت کرنے والا ہے۔ لیکن جب روس میں اشتراکی نظام قائم ہوا تو بڑے بڑے سرمایہ داروں کے حقوق نظر انداز کر دیئے گئے۔ بجائے اس کے کہ اس ملک کے دوسرے شہری افراد جن کے پچاس فیصد حقوق پورے ہو رہے تھے اور پچاس فیصد حقوق تلف ہو رہے تھے اور یہ بڑے سرمایہ دار جن کے پاس ان کے اصل حقوق سے زیادہ مال موجود تھا ان سب سے یکساں سلوک کیا جاتا اور سرمایہ داروں سے صرف اتنا کہا جاتا کہ یہ زائد مال تمہارا نہیں ہے یہ لاؤ اور غریبوں کے حقوق کو پورا کرو اُن سے اموال ہی نہیں چھینے بلکہ زندگیاں بھی چھین لیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو قوت اور استعداد ان کو دی تھی وہ بھی ہلاک کر دی گئی۔

خدا کی تقدیر ہی چلتی ہے لیکن یہ کبھی کسی شکل میں سامنے آتی ہے اور کبھی کسی شکل میں، کبھی اللہ تعالیٰ اپنی قدرتوں کے حسن کے اظہار کے لیے اپنی تقدیر کو دنیا میں ظاہر کرتا ہے، کبھی اپنے بندوں کی بدصورتی کے اظہار کے لیے اپنی تقدیر کو ظاہر کرتا ہے۔ پس ان بندوں کی بدصورتی کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ کی تقدیر اس صورت میں ظاہر ہوئی کہ انہوں نے امیروں کو قتل ہی کر دیا اور ایک بڑا ظالمانہ رویہ اختیار کیا۔

اسلام اس ظلم کو برداشت نہیں کر سکتا جس طرح اس چیز کو برداشت نہیں کر سکتا کہ غریب پر ظلم ہو کیونکہ اسلام کی نگاہ میں جیسے ایک امیر خدا کی مخلوق ہے ویسے ہی ایک غریب بھی اس کی مخلوق ہے اور جیسا کہ ایک غریب اس کی مخلوق ہے ویسا ہی ایک امیر بھی اس کی مخلوق ہے۔ ہر دو کے حقوق کی حفاظت اسلام اور اسلام کا اقتصادی نظام کرتا ہے لیکن نہ سرمایہ داری کا عمل اور نہ اشتراکیت کا طریق یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ہر انسان کے حق کو اس نے قائم کرنا اور ادا کرنا ہے اور

نہ اس پر پورا اُترتا ہے۔ اس کے مقابلے میں خدا تعالیٰ کی عبودیت کے پہلے تقاضے کا جلوہ ہمارے سامنے اسلام کا اقتصادی نظام یہ پیش کرتا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ ہر انسان میں جو قوت اور استعداد پائی جاتی ہے۔ ربّ العالمین نے اس کی صحیح اور کامل نشوونما کی ذمہ داری لی ہے۔ کوئی دوسرا نظام اس قسم کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

پس اسلام کا اقتصادی نظام مستقل حیثیت میں ارفع اور اعلیٰ شکل میں دنیا میں قائم ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے جتنے تقاضے ہیں انہیں پورا کرنے والا ہے۔ پہلا تقاضا یہ تھا کہ صفات باری تعالیٰ کے جلوے نظر آئیں، کیونکہ اسلام جو توحید کو قائم کرنے والا ہے اس کے تمام احکام خدا تعالیٰ کی صفات کے جلوے ظاہر کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کے سامان پیدا کرنے والے ہیں اس کی کوئی تعلیم ایسی نہیں جو توحید سے دور لے جانے والی ہو۔ اس کی ہر تعلیم توحید کے قریب لے جانے والی ہے۔

غرض یہ اپنی نوعیت کا اکیلا ہی نظام ہے کوئی دوسرا نظام اس کے مقابلے پر نہیں آ سکتا۔ اور بعض لوگ جو اسلام کی خوبیوں سے واقف نہیں وہ بعض دوسرے نظاموں کی خوبیوں سے مرعوب ہو جاتے ہیں، وہ اسلام پر کسی دوسری چیز کا پیوند لگانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ اگر سونے پر پیتل کا پیوند لگایا جائے تو وہ سونے کی قدر و منزلت کو دوبالا نہیں کر سکتا۔ اسلام کا نظام تو ایک سونا ہے دوسرا ہر نظام کوئی تانبا ہے، کوئی پیتل ہے، کوئی لوہا ہے، کوئی کچھ ہے اور کوئی کچھ اسلام کے اقتصادی نظام کے ساتھ اس کا مقابلہ ہی نہیں۔ پس خالص اقتصادی نظام قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اب جیسا کہ میں نے بتایا ہے گیارہ تقاضوں میں سے عبادت کا پہلا تقاضا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایک ایسا خالص نظام ہے جس کے نتیجہ میں توحید خالص قائم ہوتی ہے اسلام کا اقتصادی نظام اللہ تعالیٰ کی صفات میں غیر اللہ کی شرکت کے تصوّر سے منزّہ ہے اور خدا تعالیٰ کی صفات کے جو تقاضے انسان پر عائد ہوتے ہیں مثلاً کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا رنگ اپنے اوپر چڑھاؤ۔ اسلام کا اقتصادی نظام ان تقاضوں کو پورا کرنے والا ہے۔ اور صفات باری تعالیٰ کی بنیادوں پر جو اقتصادی نظام قائم کیا جائے اس کا مقابلہ وہ نظام نہیں کر سکتے جن کے قائم کرنے میں معرفت الٰہی اور عرفانِ صفات باری کا کوئی تعلق نہ ہو اور انسان کی اپنی عقل اور اپنی سمجھ بُوجھ پر جن کا انحصار ہو۔

(الفضل ۲۳ وفا ۱۳۴۸ ہش / جولائی ۱۹۶۹ء)

اسلام کا اقتصادی نظام

اُمّہاتُ الصِّفات

پر قائم ہے

خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۳- احسان (جون) ۱۳۴۸ ہش / ۱۹۶۹ء

" اسلام کا اقتصادی نظام امّہات الصفات (سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی جو چار صفات بیان ہوئی ہیں) پر مبنی اور قائم ہے اور خصوصاً اس میں ہمیں رب العالمین کے جلوے نظر آتے ہیں"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

مَیں بتا رہا تھا کہ سب مذاہب کی غرض ہی یہ تھی کہ توحید خالص کو قائم کیا جائے مگر اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ قرآن کریم کی تعلیم کے نتیجہ میں انسان کو وہ روشنی مکمل طور پر عطا کی ہے جو توحید خالص کو قائم کرتی اور واضح کرتی اور اپنے جلووں میں انسان کے دل اور دماغ اور رُوح کو لپیٹ لیتی ہے۔ اسلام کی ساری ہی تعلیم توحید باری کو قائم کرنے والی اور اس کے تقاضوں کو پُورا کرنے والی ہے اور اسلام کا اقتصادی نظام ان خصوصیات کا ہی حامل ہے۔

مَیں نے بتایا تھا کہ اسلام کا اقتصادی نظام اُمّہات الصّفات (سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی جو چار صفات بیان ہوئی ہیں) پر مبنی اور قائم ہے اور خصوصاً اس میں ہمیں رب العالمین کے جلوے نظر آتے ہیں۔

ربّ کے معنی ہیں اوّلؔ جس نے انسان کو پیدا کیا۔ دوسرؔے یہ کہ جس نے ہر شخص کو مختلف قوتیں اور استعدادیں عطا کیں اور تیسرؔے یہ کہ جس نے ہر انسان کی روحانی، اخلاقی، ذہنی اور جسمانی طاقتوں اور قوتوں کو ایک دائرہ استعداد میں محدود اور مقیّد کیا۔ جیسا کہ فرمایا:-

فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (الفرقان آیت ۳)

چوتھے معنی ربّ کے یہ ہیں کہ جس نے ان قوّتوں کو زوال سے بچانے اور ہلاکت سے محفوظ رکھنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی انہیں پیدا کیا۔ پانچویں یہ کہ جس نے حقیقی اور کمال نشوونما کے سامان پیدا کیے اور ان صفات کی وجہ سے اسلام کا اقتصادی نظام بہت سے حقوق قائم کرتا ہے۔

وہ پہلا حق یہ قائم کرتا ہے کہ ہر فرد بشر کو اپنے دائرہ استعداد میں اپنی روحانی اخلاقی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو نشوونما تک پہنچانے کے لیے جس چیز کی بھی ضرورت ہے وہ چونکہ ربّ العالمین نے اس کے لیے پیدا کی ہے اس لیے یہ اس کا حق ہے کہ وہ چیز اسے ملے بطور حق کے نہ بطور احسان اور صدقہ وخیرات کے۔

دوسری اصولی بات جو ہمارے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ ہر ایسا مطالبہ جو انسان کی جسمانی ذہنی اخلاقی اور روحانی قوتوں میں خلل پیدا کرنے والا اور ہلاکت کی طرف لیجانے والا ہے وہ حق نہیں، باطل ہے اس لیے ردّ کر دیا جائیگا۔ مثلاً یورپین اقوام کے عوام بعض دفعہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمیں شراب اتنی نہیں ملتی جتنی ہم پینا چاہتے ہیں یا سؤر کی چربی امیروں کو میسّر ہے اور ہم بچارے غریب اس سے محروم ہیں۔ یہ فقرہ مَیں نے اس لیے بولا ہے کہ جب میں اکسفورڈ گیا

تو مجھے یہ خیال تھا کہ کہیں کالج والے مجھے غلط قسم کے کھانے نہ دیں۔ چنانچہ میں پہلے ہی دن باورچی خانہ میں گیا، جو
بہت بڑا تھا اور سب سے بڑے باورچی سے جا کر کہا کہ ایک تو مَیں گوشت نہیں کھاؤں گا کیونکہ وہاں ذبیحہ نہیں ملتا تھا
اور دوسرے تم جو مچھلی اور انڈا میرے لیے پکاؤ اس کو چربی میں نہ پکانا، مکھن میں پکانا۔ وہ باورچی مسکرایا اور کہنے لگا
غریب طالب علم یہاں پڑھنے کے لیے آتے ہیں وہ سؤر کی چربی کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے یعنی ان کی مالی حالت
ہی ایسی نہیں ہوتی کہ ہم اُن کے لیے سؤر کی چربی خرید کر کھانا پکائیں اور ان سے پیسے لیں، اگر ان حالات کو دیکھ کر غریب
یہ کہے کہ سؤر کی چربی یا گوشت ہمیں بھی ملنا چاہیئے تو اسلام کا اقتصادی نظام حرام چیز نہ صرف اس کو نہیں دیگا،
بلکہ جو امیر ہے اس کو بھی وہ حرام چیز نہیں دیگا۔ پھر دل بہلاوے کے لیے دنیا میں جُوئے کی قسم کی بیسیوں کھیلیں بنائی
گئی ہیں جن کے نتیجہ میں کروڑوں اربوں روپیہ غریب کا امیر کی تجوریوں کو بھرتا ہے۔ اس قسم کے دل بہلاوے جو ہیں ان
کے مطالبے اسلام کا اقتصادی نظام منظور نہیں کرے گا، وہ ایسے مطالبے کو ردّ کر دے گا۔ کیونکہ یہ بھی ایک اقتصادی
سوال ہی ہے۔ یعنی پیسے کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ اس کے نتیجہ میں ذہنی، اخلاقی اور روحانی گراوٹ پیدا ہوتی ہے۔
اسی طرح عیاشی کے بہت سے مطالبات ہیں۔ یورپین اقوام جب اپنی ذاتی دلچسپیوں کے لیے اور اپنے ملک کی خاطر لُوٹ
کھسوٹ کے لیے دوسرے ملکوں پر دھاوا بولتی اور وہاں فوجیں بھجواتی ہیں تو سپاہیوں کے ساتھ ایک فوج کنچنیوں کی بھی بھیجی جاتی
ہے۔ بہرحال یہ اُن کا ایک مطالبہ ہے۔ لیکن اسلام عیاشی کے اس قسم کے مطالبات کو منظور نہیں کرتا۔ غرض ہر وہ مطالبہ جو
جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی قوتوں میں خلل پیدا کرنے والا ہوگا اسلام کا اقتصادی نظام اسے ردّ کر دے گا۔
تیسری خصوصیت ہمیں یہ نظر آتی ہے کہ جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے قَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے
لیے ایک قوت پیدا کی ہے اور ایک دائرہ مقرر کر دیا ہے۔ انسان اس سے باہر نہیں جا سکتا۔ لیکن اگر کسی شخص کا یہ مطالبہ
ہو کہ مجھے اتنے پیسے ملنے چاہئیں تاکہ میں یہ کروں وہ کروں (آگے مثال اس کو واضح کرے گی) اور وہ مطالبہ دائرۂ استعداد
سے آگے بڑھنے والا ہو تو اسلام کا اقتصادی نظام اُسے ردّ کر دیگا۔ مثلاً اگر کوئی طالب علم جو بالکل غبی ہے اور جس کی قابلیت
میٹرک سے آگے پڑھنے کی ہے ہی نہیں یہ مطالبہ کرے کہ میں غریب ماں باپ کا بیٹا ہوں میں آگے پڑھ نہیں سکتا مجھے وظیفہ
دیا جائے تاکہ مَیں کالج میں پڑھوں۔ تو چونکہ کالج میں پڑھنے کی طاقت اور قوتِ ذہنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے نہیں دی
گئی اس لیے اس کا یہ مطالبہ ردّ کر دیا جائے گا کیونکہ اس کا یہ حق نہیں بنتا۔ اس کے اندر اس کی قوت ہی نہیں۔ اس کی قوت
اور دائرہ استعداد اس کے حق کو معین کرتا اور اس کی حد بندی کرتا ہے۔ یا ایک امیر کہے کہ مَیں نے اپنا کچھ روپیہ اپنے نااہل
بچہ کی تعلیم کے اوپر خرچ کرنا ہے تو صحیح اسلامی اقتصادی نظام اس امیر کو بھی خرچ نہیں کرنے دے گا، کیونکہ اس کے نتیجہ
میں کسی اور کی حق تلفی ہوتی ہے۔
دوسری مثال میں نے اس وقت جامعہ احمدیہ کی لی ہے مَیں سمجھتا ہوں کہ جامعہ احمدیہ میں داخلہ کے لیے

ہر اس طالب علم کا حق ہے جو ذہنی، اخلاقی جسمانی اور روحانی قوتوں کے لحاظ سے اس قابل ہو کہ وہ حقیقی معنی میں خادمِ دین
بن سکے۔ قربانیاں دے سکے اور اس روح سے کام کر سکے جو رُوح ایک واقف زندگی میں ہونی چاہیئے ایسا شخص ہی
جامعہ احمدیہ میں داخلہ کے لیے مطالبہ کر سکتا ہے۔ اگر ہم ایسے طالب علم کی بجائے ایک ایسے طالب علم کو داخل کر لیتے ہیں
جس کا دائرہ استعداد جامعہ احمدیہ کے نقطہ نگاہ سے ایسا نہیں کہ وہ جامعہ احمدیہ میں علم حاصل کر کے اسلام کا مبلغ بنے تو ہم
کسی اور کی حق تلفی کر رہے ہیں۔ کیونکہ اس کے لیے وہ روپیہ ربّ العالمین نے پیدا ہی نہیں کیا۔ اس نے ہر ایک کے لیے اُتنا
ہی پیدا کیا ہے جتنی اس کو استعداد اور قوت ملی ہے۔ ایسے مطالبات جو انسان کی قوتوں کی کامل نشوونما میں روک بنیں ردّ کیے
جائیں گے۔ مثلاً قوت ابھرتی ہے اس سے کام لینے سے، قوت ابھرتی ہے آپس میں مقابلہ کروا کر اور اس کی مختلف صورتیں
ہیں۔ اور جدوجہد مقابلہ اور مجاہدہ (یعنی حصول علم کے لیے کچھ کرنے، قربانی دینے اور تکلیف اٹھانے) کے بغیر صحیح نشوونما
ہو نہیں سکتی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ طَلَبَہ کی طرف سے ناجائز رعایات کے مطالبے اسلام کا اقتصادی نظام نامنظور کر دیگا۔
مگر اس کے ساتھ ہی ان کو سب جائز سہولتیں بھی مہیا کی جائیں گی۔ یعنی ہر جائز چیز، ہر جائز سہولت ان کو دی جائے گی۔ ہر وہ
انتظام کیا جائیگا جو اُن کی نشوونما میں ممد ہو۔ لیکن یہ مطالبہ کہ ہمیں مثلاً چالیس فیصد نمبروں پر سیکنڈ ڈویژن دی جائے یا
اس قدر نمبروں پر ہمیں پاس کر دیا جائے بعض حالات میں ناجائز ہے۔
جن قوموں نے دنیوی لحاظ سے ترقی کی ہے انہوں نے اپنے بعض امتحانات کے لیے ستر فیصد نمبر لینے والے کو بھی
فیل قرار دیا ہے۔ ابھی چند مہینے ہوئے ایک پاکستانی احمدی کا خط میرے پاس آیا جو انگلستان میں ایک کورس کے لیے گئے
تھے۔ انہوں نے لکھا کہ مَیں نے پہلے تین پرچوں کا امتحان دیا دو پرچوں میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے مجھے نوّے فیصدی سے
اوپر نمبر ملے اور میں کامیاب ہو گیا، لیکن ایک پرچہ میں مجھے صرف ستّر فیصد نمبر ملے اور میں فیل ہو گیا ہوں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ
مجھے اگلے امتحان میں اس میں بھی کامیاب کر دے۔ پس جو دنیوی لحاظ سے آگے بڑھنے والی قومیں ہیں انہوں نے دنیوی ترقیات
کے لیے اس نقطہ کو سمجھا ہے۔ لیکن اصولی طور پر حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ ناجائز رعایت جو حقیقی نشوونما میں روک بنتی ہے جرأت
کے ساتھ ردّ کر دینی چاہیئے، لیکن طالب علم کو ہر وہ جائز سہولت میسر آنی چاہیئے جو اس کی نشوونما میں ممد اور معاون ہو۔
اور اس کے لیے اسے مطالبہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیئے، اس کے لیے اسے ایجی ٹیشن کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیئے۔ ہر چیز اسے میسر آنی
چاہیئے جو اس کی ذہنی قوتوں کی نشوونما کو ان کے کمال تک پہنچانے والی ہو، ان کی بہترین تعلیم کا انتظام کیا جائے اگر سائنس لی ہے تو بہترین اپریٹس
(APPARATUS) دیا جائے۔ بہترین لائبریریاں قائم کی جائیں مناسب اور طیّب غذا کا انتظام کیا جائے۔ ایک مزدور
اور ایک طالب علم کی غذائی ضروریات میں فرق ہے، اس فرق کو مدِّنظر رکھا جائے۔ اس کی ذہنی ارتقاء کے لیے با اخلاق
ماحول ضروری ہے وہ پیدا کیا جائے۔ پھر عقلمند اور ہمدرد اساتذہ ضروری ہیں خود اعتمادی اور عزت نفس پیدا کرنے کے
لیے سینکڑوں وسائل ہیں جو انہیں میسر آنے چاہئیں، تاکہ ہمارا بچہ، ہمارا ایک مسلمان بچہ ذہن اس وقت اسلام کے اقتصادی

نظام کے متعلق بات کر رہا ہوں) پوری طرح خود اعتمادی کے وصف سے متصف ہو۔ اس میں عزتِ نفس ہو۔ وہ با اخلاق ہو، جو ہمدردانہ اور مشفقانہ سلوک اس نے اپنے اساتذہ سے پایا وہی ہمدردانہ اور مشفقانہ سلوک وہ آگے پہنچانے والا ہو۔ اس کی غذائی ضرورتیں جو تعلیم کے لحاظ سے ضروری ہیں اسے میسر آنی چاہئیں۔ مثلاً کوکا کولا یا سیون اپ کی بجائے طالب علم کو دودھ پینا چاہیئے۔ اتنی رقم اگر وہ دودھ پر خرچ کرے اور وہ اس کو ہضم کر سکتا ہو (کیونکہ بعض انسان دودھ ہضم نہیں کر سکتے) تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اگر کوئی شخص دودھ ہضم نہیں کر سکتا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بعض ایسی چیزیں پیدا کی ہیں کہ اگر وہ دودھ میں ملا دی جائیں تو وہ ہضم ہو جاتا ہے۔ مثلاً سونٹھ کی گٹھی ہے۔ ربّۃ البیت جب دودھ کو اُبالنے کے بعد رکھتی ہے تو اگر وہ اس میں سونٹھ کی ایک گٹھی ڈال دے تو ایک تو دودھ پھٹے گا نہیں، دوسرے اس کا وہ بچہ بھی اس دودھ کو ہضم کر لے گا، جو عام طور پر اُسے ہضم نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے طریق ہیں جن کو اختیار کر کے دودھ کو ہضم ہونے کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ بہرحال ایک طالب علم کو مناسب اور طیّب غذا ملنی چاہیئے، اسے مناسب ماحول ملنا چاہیئے اُسے با اخلاق ماحول ملنا چاہیئے۔ اساتذہ کا انتخاب سفارشوں کی بجائے اُن کے استاد ہونے کی اہلیت اور تربیت کرنے کی اہلیت کی بنا پر کرنا چاہیئے تاکہ طلبہ میں خود اعتمادی پیدا ہو، ان میں عزتِ نفس پیدا ہو۔ جس قوم کا ہر بچہ اپنی قوت اور استعداد کو اپنے کمال تک پہنچاتا ہے وہ قوم اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ لیکن جس قوم کے نصف بچوں کی قوتیں اور استعدادیں اپنے نشوونما میں کمال کو نہ پہنچ سکیں تو وہ قوم اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ یہ بات اس قوم کی غلط پالیسی کے نتیجہ میں ہو یا اس کے غلط منصوبوں کے نتیجہ میں۔ اس کی جہالت کے نتیجہ میں ہو یا اس بات کو نہ سمجھنے کے نتیجہ میں ہو، کہ ہر بچہ کی قوتوں کو ان کے کمال تک پہنچانا چاہیئے۔ بہرحال جس قوم کے نصف بچوں کی قوتیں اور استعدادیں اپنے کمال کو نہیں پہنچتیں وہ آدھی قوم ہے، پوری قوم نہیں اور وہ اس قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتی، جس قوم کے ہر فرد و بشر نے اپنی ہر قوت اور کمال اور طاقت کو نشوونما میں اپنے کمال تک پہنچا دیا ہے۔

چوتھی بات اسلامی اقتصادی نظام میں ہمیں یہ نظر آتی ہے کہ ہر فرد و بشر کی سب جائز ضرورتیں اسلام کے اقتصادی نظام میں پوری ہوں گی اور اس کے سارے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ مَیں دو ایک مثالیں دے سکتا ہوں اور ان مثالوں میں اس طرف اشارہ کر دیتا ہوں تا آجکل جو مختلف اُلجھنیں ہیں وہ اس وقت سننے والوں کے سامنے آجائیں۔ مثلاً مزدور کو نقصان پہنچانے کے لیے سرمایہ دار کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ لاک آوٹ (LOCKOUT) یعنی تالا بندی کرے دنیا نے ظالمانہ غصّہ نکالنے کا ایک طریق یہ بھی ایجاد کیا ہے کہ جس وقت مزدور اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرتا ہے تو اس کو تنگ کرنے کے لیے سرمایہ دار اپنے دروازوں پر تالے ڈال دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نہ تم سے کام لیں گے اور نہ مزدوری دیں گے۔ ایسا کرنے کی اجازت اسلام کا اقتصادی نظام نہیں دے گا۔ اسی طرح مزدور کو بھی سٹرائیک (STRIKE) کے ذریعہ اپنے حقوق حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی، کیونکہ اسے بغیر سٹرائیک (STRIKE) کے حقوق مل رہے

ہوں گے۔ غربت اور حقیقی ضرورتوں سے محرومی کی زنجیروں نے اُسے اپنے شکنجہ میں نہ جکڑا ہوگا کہ وہ انہیں توڑنے کی ضرورت محسوس کرے۔ یہ صحیح ہے کہ اُسے نکمّا بیٹھنے کی اجازت نہ دی جائے گی، کیونکہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا نشوونما کو کمال تک پہنچانے کی ضد ہے لیکن اگر تلاشِ روزگار کے باوجود اسے کام نہ ملے یا اس کا دائرہ استعداد اس کی اور اس کے خاندان کی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکے تو اسلام کا اقتصادی نظام اس کی ضرورتوں کو پورا کریگا۔ مثلاً ایک شخص کو صرف اتنی طاقت ملی ہے کہ وہ درمیانہ درجہ کی مزدوری کر سکتا ہے اور وہ مزدوری کرتا بھی ہے لیکن صرف اتنے پیسے کماتا ہے کہ جس سے تین آدمیوں کا شریفانہ گذارہ ہو سکے لیکن جہاں اللہ تعالیٰ نے اس کو کمانے کی قوتیں دوسروں کے مقابلہ میں کم دیں اس نے اس کو ایک اور نعمت سے نوازا اور اس کو ایک بچّہ کی بجائے آٹھ بچے دیدیئے یا اس کو ایک بچہ دیا جو اتنا ذہین ہے کہ اگر اس کے ذہن کی پوری نشوونما ہو سکے تو وہ ڈاکٹر عبد السلام بن سکتا ہے یعنی اپنے علم میں، اپنے مضمون میں وہ دنیا کے چوٹی کے دماغوں کا مقابلہ کر سکتا ہے، تو ایسے مزدور کو بھی فکر کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے آٹھ بچوں کا پیٹ پالنا بھی اسلام کے اقتصادی نظام کی ذمہ داری ہے اور اس بچہ کی صحیح نشوونما کر کے اس کی ذہنی طاقت کو اور قوت کو اور استعداد کو اس کے کمال تک پہنچانا کہ وہ دنیا کے گنتی کے چند سائنس دانوں میں شمار ہونے لگے۔ اس کمال تک پہنچانا بھی اسلام کے اقتصادی نظام کی ذمہ داری ہے۔ خدا تعالیٰ کی کسی نعمت کو ٹھکرا کر خدا تعالیٰ کا ناشکرا بندہ بننے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

پانچویں یہ کہ قوتوں اور استعدادوں میں تفاوت رب العالمین نے پیدا کیا ہے اس تفاوت کو تسلیم کرنا بندۂ خدا کا کام ہے۔ اس کے نتیجہ میں حسد نہیں پیدا ہونا چاہیئے، اس کے نتیجہ میں نفرت اور بغض نہیں پیدا ہونا چاہیئے، اس کے نتیجہ میں استہزا اور حقارت کے جذبات نہیں پیدا ہونے چاہئیں (کسی دماغ میں یہ پیدا ہو سکتے ہیں اور کسی دماغ میں وہ پیدا ہو سکتے ہیں) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو دوسرے کا خادم بنانے کے لیے یہ تفاوت رکھا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عاجزی کے مقام پہ لانا تھا۔ سرمایہ دار کو بھی اللہ تعالیٰ نے خادم بنایا اور وہ اس طرح کہ اس کو کہا کہ تو ان بیکسوں یتامیٰ اور مساکین کے لیے جا کر محنت کر اور پیسے کما۔ کیونکہ جب اس نے پیسے کمائے تو خدا نے یہ نہیں کہا کہ مَیں نے جو قوت تمہیں دی تھی اس قوت کی وجہ سے تم نے پیسے کمائے ہیں، مَیں نے تمہیں جو ذہن دیا تھا اور مَیں نے تمہیں جو انتظامی قابلیت دی تھی اس کے نتیجہ میں تو لاکھ پتی ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ مال تیرا ہے جس طرح تو چاہے اسے خرچ کر۔ خدا تعالیٰ نے اسے یہ نہیں کہا بلکہ اس نے اسے یہ کہا کہ میں نے تمہیں جو قوتیں بھی دی تھیں وہ بطور خادم کے دی تھیں تو نے ان قوتوں کا صحیح استعمال کر کے مال کو جمع کر لیا ہے اور بطور خادم کے جمع کیا ہے۔ اب مَیں تمہیں یہ کہتا ہوں کہ مَیں نے یتامیٰ اور مساکین ریا جن کو ہم سائل اور محروم بھی کہہ دیتے ہیں) کے حقوق تمہارے مال میں مقرر کیے ہیں اس لیے تو یہ مال ان کے ہاتھوں میں جا کر دے۔ غرض ایک امیر کو بھی خادم بنایا اور ایک غریب کو بھی خادم بنایا ہر ایک کو اپنے مقابلہ میں اس کا مقام بتا دیا اور وہ عاجزی کا مقام ہے۔ اور ہر ایک کو کہا کہ دوسرے سے استہزا نہیں کرنا، نفرت نہیں کرنی۔ دشمنی نہیں کرنی، حقارت سے پیش نہیں آنا۔

سب کو اخوت اور ہمدردی اور شفقت اور محبت کے بندھنوں میں باندھ دیا اور کہا کہ جو معاشرہ ہم قائم کرتے ہیں اس میں ہر قوت چھوٹی ہو یا بڑی خادم کی حیثیت رکھتی ہے۔ معزز وہی ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا کرے۔ نہ سرمایہ دار کی دولت اس کی عزت کا باعث ہے اور نہ کوئی مزدور اور کسان تمسخر اور استہزا کا نشانہ۔ دونوں بھائی شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔

چھٹی بات جو اس اقتصادی نظام میں جو خدا تعالیٰ کی صفات پر مبنی ہے (میں صفات کو لے رہا ہوں) وہ یہ ہے کہ جو لوگ خود نہیں کما سکتے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے جلوے اس نظام میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک بچہ ہے وہ خود نہیں کما سکتا اس لیے باپ کو کہا کہ تُو نے اس بچہ کا حق ادا کرنا ہے۔ بعض ماں باپ عدم تربیت کی وجہ سے بچوں کے حقوق ادا نہیں کرتے اور کہہ دیتے ہیں کہ ہم ماں باپ ہیں اس لیے جو چاہیں کریں۔ خدا کے نزدیک جو چاہیں کریں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم ماں باپ ہو بچہ کا فرض ہے کہ وہ ماں باپ کا احترام تمہیں دے اور یہ بچہ ہمارا بچہ ہے تمہارا فرض ہے کہ اس کے حقوق تم ادا کرو۔ یا مثلاً ایک شخص بیمار ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ہی شخص کمانے والا ہے اور وہ اتنا ہی روز کماتا ہے کہ جس میں اس کا اور اس کے خاندان کا گذارہ ہوتا ہے ایک دن وہ بیمار ہو گیا۔ اسے ملیریا بخار ہو گیا اور وہ دو دن کے لیے مزدوری نہ کر سکا۔ تو اسلام کے اقتصادی نظام میں ان دونوں کی اجرت بھی اُسے ملیگی کیونکہ کوئی اور شخص اس کے لیے کما رہا ہے اور اس کی ضرورت کو پورا کیا جا رہا ہے۔ کسی کی محنت کے نتیجہ میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے جلوہ کے نتیجہ میں۔

ساتویں بات ہمیں اس نظام میں یہ نظر آتی ہے کہ اس نظام میں ہر شخص خدائے رحیم کی رحیمیت کے حُسن کا گرویدہ ہے کیونکہ جو مزدوری وہ کرتا ہے اس کے متعلق انتظام کیا گیا ہے کہ اسے اجرت صحیح اور بروقت ملتی رہے۔

اور آٹھویں یہ کہ ربّ العالمین نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اس نے ہر فردِ بشر کی قوت کا دائرہ محدود اور معیّن کر دیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی مزدور سے اس کی طاقت سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ جس طرح کوئی غریب یا مسکین اپنے دائرہ استعداد سے بڑھ کر کوئی مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کوئی شخص اس کی طاقت اور استعداد سے زیادہ کام نہیں لے سکتا (لیکن دائرہ استعداد میں کمال نشو و نما و ارتقا کے سب سامان اس کے لیے فراہم اور مہیّا کیے جائیں گے) کیونکہ یہ ربوبیت عالمین کے خلاف ہے اور اسلامی اقتصادی نظام اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس لیے کسی سے بھی اس کے دائرہ استعداد سے بڑھ کر کام لینے کی اجازت نہیں۔ پس یہ نظام طاقت سے بڑھ کر بوجھ نہیں ڈالتا، مگر جہاں تک حقیقی ضرورتوں کا سوال ہے وہ سب پوری کی جاتی ہیں۔

اس نظام میں اللہ تعالیٰ کے مالک ہونے کے جلوے بھی ہمیں نظر آتے ہیں۔ کوئی شخص اقتصادی لحاظ سے اپنا یا غیر کا حق اسلام کے اقتصادی نظام میں قائم نہیں کرتا۔ بلکہ سارے حقوق خدا تعالےٰ نے قرآن کریم میں مقرر کیے ہیں

امیر کے بھی اور غریب کے بھی۔ اس نے جائز راستے کمانے کے بھی بتائے اور جائز راستے خرچ کے بھی بتائے۔ ناجائز کمائی کے راستوں کو بھی بند کیا اور ناجائز خرچ کے راستوں کو بھی بند کیا۔ اسلام کا اقتصادی نظام اللہ تعالیٰ کی مالکیت کو ثابت کرتے ہوئے کسی انسان کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اپنا یا کسی غیر کا حق قائم کرے، بلکہ حقوق کے قیام کا سارے کا سارا حق اللہ تعالیٰ کو دیتا ہے اس لیے باہمی رنجشوں کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورۂ یاسین میں فرمایا ہے:

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا
لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا
فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (آیت ۴۸)

کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے اس سے اگر وہ یہ نتیجہ نکالیں کہ اللہ کی اس عطا کو جس طرح وہ چاہیں انہیں خرچ کرنے کا حق ہے تو یہ غلط ہے وہ کہتے تو یہ ہیں:

اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ

کہ جسے اللہ چاہتا خود ہی دے دیتا۔ ہمارے ذریعہ اس نے کیوں دلوانا تھا وہ تو سارے خزانوں کا مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تمہیں تو یہ رزق اس لیے دیا گیا ہے کہ تمہیں ابتلا میں ڈالا جائے۔ یہ دنیا تو ابتلا اور امتحان کی دنیا ہے تمہیں یہ رزق میں نے اس لیے دیا ہے کہ میں تمہیں خادم بنانا چاہتا تھا میں نے تمہیں خادم بنایا ہے اور تمہیں کہا ہے کہ تم لاکھوں روپے کماؤ تا کہ ان یتامیٰ اور مساکین کی لاکھوں کی ضرورت پوری کی جائے جن کو ہم نے براہِ راست نہیں دیا۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ تمہاری یہ باتیں کھُلی کھُلی گمراہی اور حقیقت سے ناواقفیت اور اللہ تعالیٰ کی صفات سے جہالت کا نتیجہ ہیں۔ تو اس قسم کے میلان اور رجحان کو اسلام کا اقتصادی نظام تسلیم نہیں کرتا۔ دنیا میں مختلف فلسفیانہ نظریے، سکولز آف تھاٹ (SCHOOLS OF THOUGHT) ہیں اور انہوں نے کچھ حقوق مقرر کیے ہیں۔ لیکن اسلام کسی انسان کے قائم کردہ حقوق کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اسلام ہر دائرہ میں (اقتصادی دائرہ میں بھی) صرف اس حق کو تسلیم کرتا ہے جس کو خود اللہ نے قائم کیا ہے اور جس حق کو اللہ نے قائم نہیں کیا اُسے اسلام حق تسلیم نہیں کرتا۔

عبادت کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اطاعت صرف اللہ کی کی جائے، یعنی شعار عبودیت میں غیر اللہ کو شریک نہ بنایا جائے اس سے جیسا کہ میں نے بتایا تھا انسان غیر اللہ کی غلامی سے یکسر آزاد ہو جاتا ہے۔ اللہ کے غیر کی غلامی کی جو مختلف شکلیں ہمیں نظر آتی ہیں ان میں سے ایک اقتصادی غلامی بھی ہے۔ ایک کتاب ہے "WATERS FLOWING EAST WARD" اس میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ بعض منصوبے دنیا میں اس لیے بھی بنائے گئے ہیں کہ تمام انسانوں کو اقتصادی زنجیروں میں جکڑ کر غلام بنا دیا جائے اور اس کے لیے ایک طریق یہ اختیار کیا گیا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر امدادی قرضے دیئے جائیں۔ اس کتاب

ہیں اس پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ ان قرضوں سے کیا کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور کس قسم کی زنجیریں انسان یا قوموں کے گرد لپٹ جاتی ہیں۔ اس کی تفصیل شاید میں کسی اور موقعہ پر بیان کروں اس وقت میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تقاضا بھی اسلام کے اقتصادی نظام کو پورا کرنا چاہیئے تھا اور یہ اقتصادی نظام اسے پورا کرتا ہے اور انسان کو ہر قسم کی غلامی سے آزاد کرتا ہے۔ مثلاً بین الاقوامی قرضوں کی بنیاد جیسا کہ اس کتاب نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے سود پر ہے۔ سودی قرضے دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً دس کروڑ روپیہ قرض دیا اور اس کی میعاد تیس سال مقرر کر دی یعنی وہ بڑی رعایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تیس سال میں قرض واپس کر دینا اور پانچ فیصدی سُود دیدینا۔ اور تیس سال تک پانچ فیصد سود دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہر کروڑ روپیہ پر ڈیڑھ کروڑ روپیہ سود ادا کیا جائے گا۔ اور سرمایہ اسی طرح باقی رہے گا۔ کتاب میں بتایا گیا ہے کہ منصوبہ بنانے والوں نے جان بوجھ کر یہ منصوبہ بنایا ہے۔ تا اقوام عالم کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک مسلمان کو یہ کہا کہ

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (المائدۃ ۳:۵)

کہ اپنے باہمی تعلقات میں وہ اندرون ملک ہوں یا بیرون ملک ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ میں نے اس وقت بین الاقوامی تعلقات کی مثال دی ہے اس لیے میں انہی کی روشنی میں اس آیت کے معنے کروں گا کہ تمہارے بین الاقوامی تعلقات نیکی اور تقوٰی کے اصول پر مبنی ہوں اور گناہ یعنی حقوق اللہ کے توڑنے اور زیادتی اور عدوان یعنی حقوق العباد کے توڑنے میں ایک دوسرے کے ممد اور معاون کبھی نہ بننا غرض حقوق اللہ کو قائم کرنے اور حقوق اللہ کی ادائیگی کے لیے بین الاقوامی تعلقات مضبوط اور پختہ طور پر استوار کرنے چاہئیں نہ اس لیے کہ اقوام عالم کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ کیونکہ اللہ کا بندہ صرف ایک کا غلام بن سکتا ہے یعنی اپنے مقصد پیدائش کے لحاظ سے صرف ایک ہی ذات کا انسان غلام بن سکتا ہے اور وہ اللہ کا وجود ہے۔ اور ہر وہ غلامی جو اس غلامی کے علاوہ ہے خدا کی نگاہ میں محبوب اور پیاری نہیں اور نہ انسان کو اس غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے اسلام کے اقتصادی نظام میں ہر قسم کی اسیری اور غلامی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ صرف ایک کی غلامی ہے۔ عبودیت واحد و یگانہ ہی کے لیے ہے اور اس پر ہم سب کو فخر کرنا چاہیئے۔ باقی پھر انشاء اللہ۔

(الفضل ۳۰ وفا / جولائی ۱۳۴۸ ہش / ۱۹۶۹ء)

اِسلام کا اقتصادی نظام

انسان کے بنائے ہوئے تمام نظاموں سے

بہتر، اَرفع اور اعلیٰ ہے

خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۷ احسان (جون) ۱۳۴۸ ہش / ۱۹۶۹ء

"اللہ تعالیٰ نے بڑے مضبوط اور پختہ دلائل کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا ہے کہ اسلام جو اقتصادی نظام دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے، وہ انسان کے بنائے ہوئے ہر قسم کے اقتصادی نظام کی نسبت بہتر اور ارفع اور اعلیٰ اور احسن ہے"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تشہد وتعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے فرمایا:۔

مَیں پچھلے خطبات سے دوستوں کے سامنے یہ مضمون بیان کر رہا ہوں کہ اسلام کا اقتصادی نظام کیا اور کیسا ہے؟ اور مَیں نے بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام میں ہمیں وضاحت سے تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ انسان کی پیدائش کی غرض صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے واحد و یگانہ کی پرستش و عبادت کرے اور قرآن کریم کی ایک آیت (الذاریات ۵۱:۵۷) میں اس مقصد کی طرف، اس بنیادی تعلیم کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا "مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ" (البیّنۃ : ۶) کہ عبادت جو ہے وہ دین کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرتے ہوئے ہونی چاہیئے۔

مَیں نے بتایا تھا کہ دین کے گیارہ لغوی معانی اِس جگہ چسپاں ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ مضمون کے تین خطبات الفضل میں چھپ چکے ہیں ان میں نو معانی کے متعلق ابتدائی مضمون آچکا ہے اور اس تمہید کے بعد جس کا بنیادی تعلیم سے تعلق ہے مَیں نے قرآن کریم کی ایک آیت جس پر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے حضورؑ کی بیان فرمودہ تفصیل کو اپنے الفاظ میں بیان کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے مضبوط اور پختہ دلائل کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا ہے کہ اسلام جو اقتصادی نظام دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے وہ انسان کے بنائے ہر قسم کے اقتصادی نظام کی نسبت بہتر اور ارفع اور اعلیٰ اور احسن ہے۔ اس کے بعد عبادت کے ان گیارہ تقاضوں کو اسلام کا اقتصادی نظام کس طرح اور کیسے پورا کرتا ہے مضمون کے اس حِصّہ کے متعلق اِس وقت مَیں بیان کر رہا ہوں۔

ایک خطبہ اس پر پہلے ہو چکا ہے۔ آج میں عبادت کے تیسرے تقاضے کو لیتا ہوں۔ عبادت کا تیسرا تقاضا جو مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ میں بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ دین کے معنی سیرت اور خُلق کے بھی ہوتے ہیں۔ "اَلدِّیْنُ: اَلسِّیْرَۃُ" یعنی سیرت کو عربی زبان میں دین بھی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ تمہارے اندر اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا رنگ پیدا ہونا چاہیئے۔ اگر تمہارے اخلاق اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا رنگ اپنے اوپر نہیں رکھتے تو تم عبادت کے تقاضا کو پورا نہیں کر سکتے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں جو یہ مقصد تھا کہ حقیقی توحید کو قائم کیا جائے اس مقصد کو تم حاصل نہیں کر سکتے۔

اِس موقعہ پر مَیں ایک اور بات ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں جس کے ایک حِصّہ کا تو آج کے مضمون کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے یعنی جو "تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللہِ" یا فنا فی اَخْلَاقِ اللہ" کا فقرہ ہم سے مطالبہ کرتا ہے لیکن

اس کے جو دوسرے حصّے ہیں ان کا تعلق بھی ان گیارہ تقاضوں کے ساتھ ہے۔ نیز جس رنگ میں وہ اسلام کے اقتصادی نظام میں جلوہ گر ہیں اُن کے ساتھ ہے اور وہ مضمون یہ ہے کہ ان عالمین یا اس UNIVERSE یا جو بھی مخلوق ہے خواہ وہ ہمارے علم میں ہو یا نہ ہو یا ہمارا تخیّل اور تصوّر وہاں تک پہنچ سکے یا نہ پہنچ سکے بہر حال جو بھی مخلوق ہے، جو چیز بھی موجود ہے ساری کی ساری اس بنیاد پر قائم، موجود اور زندہ ہے کہ خدائے واحد سب کا پیدا کرنے والا اور ساری قوتوں اور استعدادوں کا بخشنے والا ہے یعنی توحید حقیقی اور توحید خالص ایک خالص حقیقت ہے باقی سارے حقائق نسبتی ہیں، مگر یہ ایک زندہ اور ہمیشہ رہنے والی اور پختہ بات ہے اس میں کوئی شبہ نہیں، کوئی تبدیلی نہیں، اس سے کوئی انکار نہیں ہو سکتا، دنیا کی حیات اور بقا اس حقیقت پر قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے وہ اپنی ذات اور صفات میں اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، وہ کامل ہے اُس میں کوئی نقص نہیں۔

یہ توحید ہمیں دنیا میں مختلف شکلوں میں نظر آتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ فاتحہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جہاں تک انسانی زندگی کا تعلق ہے توحید خالص کے چھ جلوے ہمیں نظر آتے ہیں۔ آپ کا یہ بیان کردہ مضمون الحکم میں چھپا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ توحید پہلے دو قسموں میں منقسم ہوتی ہے۔ ایک کو تو ہم توحید علمی کہتے ہیں اور دوسری کو ہم توحید عملی کہتے ہیں۔ پھر ہر دو قسم کی توحید ایسی ہے جس کا تعلق ایک تو حقوق اللہ سے ہے، دوسرے حقوق نفس سے ہے اور تیسرے حقوق العباد سے ہے۔ پس دونوں قسم کی توحید کے چھ جلوے ہمیں نظر آتے ہیں۔ علمی توحید کے معنے یہ ہیں کہ وہ حقیقی توحید جو علم سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنی صفات بیان کیں، اپنی وحدت کے، اپنے احد ہونے کے دلائل دیئے اور آسمانی نشانوں سے بھی ثابت کیا کہ مَیں ہی اکیلا سب قدرتوں کا مالک اور سب فیوض کا سرچشمہ اور سب انوار کا مرکزی نقطہ ہوں۔ بہر حال علمی توحید وہ ہے جو علم سے حاصل کی جاتی ہے اور عملی توحید وہ ہے جو عمل سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس وقت میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بیان کردہ مضمون اپنے الفاظ میں بیان کروں گا۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ اور اس کے حقوق کا تعلق ہے توحید علمی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حقوق کو شناخت کیا جائے۔ ان کا عرفان اور معرفت حاصل کی جائے یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک جاننا اور اسے مبدء ہر ایک فیض کا اور جامع تمام خوبیوں کا اور مرجع و مآب ہر ایک چیز کا سمجھنا اور اسے ہر عیب اور نقص اور کوتاہی سے پاک جاننا۔ کیونکہ وہ تمام صفاتِ کاملہ کا جامع ہے اور معبود حقیقتاً وہی ہے۔ وہی اس بات کا سزاوار ہے کہ انسان کا معبود بنے۔ پس جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات کا سوال ہے توحید علمی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی معرفت کو حاصل کیا جائے۔ حقوق اللہ کی ادائیگی میں توحید عملی یہ ہے کہ اس کی اطاعت اخلاص سے بجا لانا۔ اور اطاعت میں کسی غیر کو شریک نہ ٹھہرانا۔ مثلاً جب بھی یہ سوال پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہے اور سرمایہ داری یہ کہتی ہے تو اطاعت اللہ تعالیٰ کی ہو سرمایہ داری کی نہ

ہو یا مثلاً یہ سوال ہو کہ اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہے اور باپ یہ کہتا ہے۔ احکام میں تضاد پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی بات ماننی ہے باپ کی بات نہیں ماننی۔ یا مثلاً یہ سوال ہو کہ اللہ تعالیٰ یہ کہتا ہے اور ایک شخص جس کا کسی فرد پر بڑا ہی احسان ہے وہ دنیوی محسن یہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بات ماننی ہے اس کی بات نہیں ماننی۔ کیونکہ سب سے بڑا محسن جو ہم اپنے ذہن میں اور تخیّل میں لا سکتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے بیشک یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ مثلاً وہ ایک یتیم بچہ تھا، اُس محسن شخص نے اسے پالا اس کو ذہین پایا اور اس کی تعلیم پر خرچ کیا، اس کی تربیت کا خیال رکھا، اس کو گندے ماحول سے بچایا، اس کی نیک ماحول میں پرورش کی۔ ہر وقت نیکی کی باتیں، ترقی کرنے کی باتیں اور ترقی کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کی باتیں اس کے دل میں ڈالیں۔ پھر اگر وہ پاکستان کا رہنے والا ہے تو اس نے پوسٹ گریجوایٹ کے بعد اس کو انگلستان بھیجا پھر وہ مشہور سائنسدانوں سے بھی آگے نکل گیا۔ یہ سارا خرچ اس شخص نے برداشت کیا۔ پھر وہ واپس آیا۔ اس شخص کی ایک ہی لڑکی تھی۔ اُس نے اپنی لڑکی سے اس کی شادی کر دی۔ اس طرح اُسے اپنی ساری جائیداد کا مالک بنا دیا۔ کتنا بڑا احسان اُس محسن نے اس پر کیا۔ لیکن اگر اس محسن کا قول یا حکم یا اس کی خواہش اور مرضی اللہ تعالیٰ کے حکم یا اللہ تعالیٰ کی مرضی اور رضا کے خلاف ہو تو توحید عملی یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس دنیوی محسن کی بات نہ مانی جائے، اللہ تعالیٰ کی بات مانی جائے۔ کیونکہ اس محسن کو جو کچھ بھی قدرت ملی، جو مال ملا، جو نیک نفسی ملی، جو دل کی پاکیزگی ملی، جو ہمدردی ملی۔ محبت اور اخوت کا جو جذبہ ملا وہ سب خدا کی طرف سے ملا۔ پس اصل فیض کا منبع یہ محسن نہیں ہے بلکہ وہ ذات ہے جس نے اس دنیوی محسن کو وہ سامان دیئے کہ جن سے وہ احسان کر سکتا تھا اور پھر اسے احسان کرنے کی توفیق دی۔ اقتصادیات میں بھی یہ سوال پیدا ہو گا جس کا توحید عملی فی حقوق اللہ کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ کہ اقتصادی نظام کے قیام میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی بات ماننی ہے یا غیر اللہ کی بات بھی کبھی مان لینی ہے اسلام یہ کہتا ہے کہ اقتصادی نظام میں بھی سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کی اطاعت نہیں کرنی، کسی اور کی بات نہیں ماننی۔ مثلاً HIPPIES ہیں۔ انگلستان میں اُن کا بڑا زور ہے وہ کہتے ہیں کہ ہمیں چرس اور دوسری قسم کے نشے مہیّا ہونے چاہئیں اور ان کا وہاں بڑا اثر و رسوخ بھی ہے۔ بڑے بڑے عہدے دار بھی ان کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے ہیں اور آہستہ آہستہ ان کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کے لیے چرس مہیّا کی جائے، حالانکہ یہ ایک بڑی خطرناک چیز ہے لیکن انگلستان اور یورپ کے دوسرے ممالک میں بڑی کثرت سے اس کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہ ایک اقتصادی مسئلہ بھی ہے۔ آیا یہ چیز پیدا کرنی ہے یا نہیں۔ اور اگر تقسیم کرنی ہے تو کس طرح۔ اسی طرح اس کی قیمتوں وغیرہ سے متعلق بیسیوں سوالات ہیں جو نظام اقتصادیات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ اقتصادی نظام اس مطالبہ کو ردّ کر دے گا۔

اللہ تعالیٰ نے عبادت کے دوسرے تقاضے میں فرمایا تھا کہ اقتصادیات میں بھی اللہ تعالیٰ کی بات ماننی ہے۔ کسی اکثریت یا کسی موثر اقلیت کی بات نہیں ماننی۔ پچھلے خطبہ میں مَیں نے بین الاقوامی قرضوں کا ذکر کیا تھا۔ آج

مَیں نے دوسری مثال بیان کردی ہے۔

غرض توحید عملی کا جہاں تک حقوق اللہ کے ساتھ تعلق ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اخلاص سے کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کسی غیر کو شریک نہیں کرنا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ بعض باتوں میں تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرلی اور بعض باتوں میں کسی غیراللہ کی اطاعت کرلی اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو ٹھکرا دیا۔ ایسا نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ مبدءِ فیوض ہے اس لیے اپنی بہبود کے لیے، اپنی ترقی کے لیے، اپنی خوشحالی کے لیے، اپنی تکالیف کو دُور کرانے کے لیے اس سے دعا مانگیں۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو اس قابل ہی نہ سمجھیں کہ وہ ان ضرورتوں کو اللہ تعالیٰ کی منشا اور مرضی کے بغیر یا اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف پورا کرسکتا ہے۔ اس واسطے ہر وقت اس پر نظر رکھنا اور اس کی محبّت میں کھوئے رہنا یہ حقوق اللہ سے تعلق رکھنے والی توحید عملی ہے۔

پھر نفس کا حق ہے، توحید علمی جو حقوق نفسی سے تعلق رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ نفس کو پہچاننا۔ جس طرح توحید علمی اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق رکھنے والی یہ تھی کہ اس کی ذات اور صفات کی معرفت اور عرفان کو حاصل کرنا۔ توحید علمی حقوق نفس سے تعلق رکھنے والی یہ ہے کہ اپنے نفس کے حقوق کو پہچاننا اور جو نفس کی آفات ہیں اور جو نفسِ امّارہ کے رذائل ہیں اُن سے ہر وقت مطلع اور چوکس رہنا کہ کہیں ان کی وجہ سے ہلاکت کے سامان نہ پیدا ہوجائیں۔ کیونکہ یہ جو نفس کی کمزوریاں نفس کی آفات، نفس امّارہ کی بدخصلتیں ہیں اور نفس کی جو بیماریاں ہیں ان کے نتیجہ میں انسان اللہ تعالیٰ کی وحدت اور اس کی توحید سے دور چلا جاتا ہے اور توحید کے تقاضے پورا کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اب جو نفس کی بیماریاں ہیں ان میں ہمیں نظر آتا ہے کہ عُجب ہے، ریا ہے، تکبّر ہے، کینہ ہے، حسد ہے، غرور ہے، حرص ہے، بُخل ہے، غفلت ہے اور ظلم ہے۔ بہت سارے اخلاق رذیلہ ہیں پس انسان کو ان کا علم ہونا چاہیئے اور اس کے CONSCIOUS MIND میں ہر وقت یہ رہنا چاہیئے۔ کہ میرا نفس بڑا کمزور ہے میرے نفس میں جو قسما قسم کی بدخواہشات پیدا ہوتی ہیں، مَیں نے ان کی طرف نہیں دیکھنا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہر وقت نگاہ رکھنی ہے۔ یہ توحید علمی حق نفس سے تعلق رکھتی ہے۔ جب انسان کو یہ علم حاصل ہوجائے کہ میرے نفس میں کیا کیا کمزوریاں ہیں اور میرا نفس مجھے کن ہلاکتوں کی طرف لے جاتا ہے۔ اور ان سے بچنے کا کیا سامان ہے تو اس سے ایک ہی ذات کی عظمت ثابت ہوتی ہے جس میں کوئی عیب نہیں اور جو اپنی ذات میں واحد و یگانہ ہے۔ ہر آدمی جب اپنے نفس کو ٹٹولے۔ اور اس کا مطالعہ کرے اور اس کی آفات اور کمزوریوں سے آگاہ ہو تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ دنیا میں ہر مخلوق عیوب سے پُر اور نقائص سے بھری ہوئی ہے، ایک ہی ذات بے عیب ہے اور تمام عیوب سے منزّہ ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ توحید علمی ہے یعنی اپنے نفس کے علم نے ہمیں بتایا کہ خدا تعالیٰ واحد و یگانہ ہے، اپنی ذات میں بھی اور اپنی صفات میں بھی۔ کیونکہ ہم نے گردن کو جھکایا، پھر دل اور سینہ پر نگاہ ڈالی، جس میں ہزار کیڑے نظر آئے، ہزار نقائص نظر آئے۔ ان بُرائیوں نے، ان کمزوریوں نے، ان نقائص نے، ان عیوب نے جھنجھوڑ کر اس طرف متوجہ کیا کہ

تمام عیوب سے پاک خدائے واحد و یگانہ ہی کی ذات ہے۔

ہمیں توحید علمی سے جہاں تک حق نفس کا تعلق تھا اقتصادیات کے میدان میں یہ پتہ لگا کہ اگر ہم حرص سے کام لیں گے، اگر ہم بخل سے کام لیں گے، اگر ہم ظلم سے کام لیں گے تو وہ نظام قائم نہیں ہوسکے گا، جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔ بخل اور حرص سے ہم کام لیں گے تو جو غیر کا حق ہے وہ اس کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔

میں نے پہلے بتایا تھا کہ یہ جو ہر قسم کا تفاوت انسانوں میں پایا جاتا ہے جس میں دولت کا تفاوت بھی ہے یہ اس لیے نہیں کہ دولت مند خدا تعالیٰ کی نگاہ میں معزّز ہے اور کریم ہے بلکہ اس لیے ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے اس کا امتحان لینا چاہتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے ایک آدمی کو ایک کروڑ روپیہ دیا اور اُسے کہا کہ تیرا اس میں حِصّہ صرف دو لاکھ ہے باقی ۹۸ لاکھ جن کا حِصہ ہے ان تک پہنچا دو۔ اس کی تفصیل انشاءاللہ بعد میں زیر بحث آئے گی۔

پس اگر بخل اور حرص ہے تو جو مال بطور امتحان کے خدا تعالیٰ نے اسے دیا ہے وہ حقدار کو نہ دے گا بلکہ دوسرے کا حق چھیننے کی کوشش کرے گا کہ میرے پاس ہی آجائے۔ پھر ظلم کرے گا۔ نفس کی حرص اور بخل اور ظلم ہی کی آفت تھی کہ قرآن کریم نے کہا کہ تولتے وقت صحیح تولا کرو۔

بخل، حرص اور ظلم کی یہ تثلیث بھی بڑی ظالم بنتی ہے کہ جو کہتی ہے کہ دیتے وقت کم تولو، لیتے وقت زیادہ تولو پھر قرآن کریم نے کہا ہے کہ جھوٹی قسمیں کھا کر لوگوں کا مال لے لیتے ہو۔ یہ باطل ہے۔ قرآن کریم نے باطل کا لفظ حق کے مقابل پر استعمال کیا ہے۔

پس جو حق خدا تعالیٰ نے قائم کیا ہے اس کو یہ حرص اور بخل اور ظلم توڑنے والا ہے اور یہ نفس کی کمزوریاں اقتصادی خرابیوں کا موجب بنتی ہیں۔ غرض انسان کو یہ پتہ لگنا چاہیئے اور اسے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ نفس میں بڑی کمزوریاں ہیں۔ مثلاً بخل ہے، حرص ہے اور ظلم ہے۔ دوسرے ہزار قسم کے اخلاق رذیلہ ہیں جو نفس میں پائے جاتے ہیں جن سے مغلوب نہیں ہونا، شکست نہیں کھانی اس توحید علمی سے یہی نتیجہ نکلتا ہے اور ہر نفس یہی نتیجہ نکالے گا کہ ہر عیب سے پاک اور ہر کامل صفت سے متصف اللہ ہی کی ذات ہے۔

جہاں تک توحید علمی کا حق نفس کے ساتھ تعلق ہے وہ یہ ہے کہ انسان عزم کرے کہ ان اخلاق رذیلہ کا مَیں نے بالکل قلع قمع کردینا ہے اور ان کو کاٹ کر رکھ دینا ہے، یعنی بجائے اس کے کہ نفس امّارہ انسان پر غالب ہو وہ نفس امّارہ اور اس کی ساری خواہشات کو ملیامیٹ کردے اور ان پر وہ کاری ضرب لگائے کہ ان کا خطرہ ہی باقی نہ رہے۔ پس عملاً نفس امّارہ کی برائیوں اور کمزوریوں پر غالب آجانا یہ توحید عملی ہے اور اس کے ساتھ پھر یہ بھی کہ تمام رذائل سے خود کو محفوظ کرلینے کے بعد تمام صفات حسنہ اور اچھے اخلاق اور فضائل کا زیور پہن لینا اور صفات حسنہ سے متصف ہوجانا یہ توحید عملی حق نفس سے تعلق رکھنے والی ہے اور ایک موحد کی اس سے یہ غرض ہوتی ہے کہ اپنے دل کو غیراللہ کے دخل سے بالکل خالی کرلے اور اس طرح پر توحید عملی حق نفس میں ثابت ہوجاتی ہے کہ نفس کی ہر وہ کمزوری جو غیراللہ کی طرف جانے والی ہے اس سے انسان بچ جاتا اور اس پر

غالب آجاتا ہے اور دل غیر اللہ سے خالی ہو جاتا ہے اور دل اللہ تعالیٰ کے اخلاق اور اللہ تعالیٰ کے انوار سے بھر جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں نفس کو فنا فی اللہ کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ صوفیاء کی ایک اصطلاح ہے جس کے یہی معنے ہیں کہ نفس امارہ کی تمام برائیوں سے بچ کر نفس مطمئنہ جن اخلاق فاضلہ کے نتیجہ میں اطمینان حاصل کرتا ہے۔ انسان کا اخلاق حسنہ کے اس زیور سے آراستہ ہو جانا یہ فنا فی اللہ کا مقام ہے۔ کیونکہ غیر بھر بیچ میں نہیں رہتا۔

پانچویں قسم کی توحید علمی حقوق العباد سے متعلق ہے اور وہ یہ کہ بنی نوع انسان کو اپنے جیسا کمزور اور لاشئے محض سمجھنا، سارے بندوں کا ایک دوسرے پر حق ہے کہ ہر شخص اس یقین پر قائم ہو کہ جس طرح مَیں عاجز بندے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں لاشئے محض ہوں، ہر دوسرا انسان بھی ویسے ہی لاشئے محض ہے۔ پھر وہ کشکول لے کر دوسرے کے پاس نہیں جائے گا۔ وہ تہجد کے وقت اُٹھ کر اپنے خدا سے مانگے گا۔ گویا تمام بنی نوع انسان کو خدا تعالیٰ کی مخلوق اور بندہ سمجھنا اور بالکل ہیچ اور نیست جاننا اور دوسرے یہ کہ اس بات پر قائم ہونا کہ جو حقوق اللہ تعالیٰ نے قائم کیے ہیں وہ توفیق باری کے بغیر محض اپنے زور سے ادا ہو نہیں سکتے۔ ایک طرف یہ کہ اپنے زور سے انسان اپنا یا کسی اور کا حق قائم نہیں کر سکتا دوسری طرف یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کا جو حق قائم کیا ہے وہ اسے ملنا چاہیئے۔ یہ حقوق العباد سے تعلق رکھنے والی توحید علمی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی ربّ ہے اس نے ساری قوتوں کو پیدا کیا ہے۔ ہندوؤں کی طرح یہ نہیں کہ روح بھی اللہ تعالیٰ کی طرح ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے اور مادی ذرّات بھی اور ان کے خواص بھی خدا تعالیٰ کی مخلوق نہیں۔ بلکہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ اللہ ربّ ہے اور اس نے اس تمام کائنات کو پیدا کیا ہے۔ اسی نے طاقتیں اور استعدادیں پیدا کیں اور حقوق قائم کیے ہیں۔ ایک یہ کہ دوسرے کو بھی اپنے جیسا لاشئے محض سمجھنا اور دوسرے یہ کہ ہر شخص کا جو حق رَبُّ الْعٰلَمِیْن نے قائم کیا ہے اسے سمجھنا اس کا علم رکھنا۔

اس توحید علمی سے جو حقوق العباد سے تعلق رکھتی ہے عظمت ایک ہی ذات کی ثابت ہوتی ہے وَعَزَّ اسْمُہٗ وَجَلَّ شَانُہٗ اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ صرف وہی ہے جو اپنی ذات میں کامل ہے۔ کیونکہ دوسرے کامل نہیں اس لیے کہ ان کے بعض حقوق انہیں کوئی دوسرا دے رہا ہے۔ اگر وہ کامل ہوتے تو وہ اپنا ہر ایک حق خود لے رہے ہوتے لیکن یہاں تو یہ نظر آتا ہے کہ کوئی شخص بھی ایسا نہیں کہ جو یہ کہے کہ مَیں اپنا حق اپنے زور سے لے رہا ہوں اس کو تو ایک عام جواب ہمارا بچہ بھی یہ دیدے گا کہ کیا تم نے اپنی ماں کا دودھ اپنے زور سے حاصل کیا تھا؟ کوئی بھی شخص جس میں ذرا بھی عقل ہو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مَیں نے اپنی ماں کا دودھ اپنے زور بازو سے حاصل کیا تھا۔ وہ تو عاجز تھا اگر ماں اس کے حق کو تسلیم نہ کرتی تو اس کو یہ حق نہ ملتا۔ بعض مائیں بعض نادان ڈاکٹروں کے مشورہ سے بچوں کو ان کے اس حق سے محروم کرتی رہی ہیں۔ اب پھر اُن کو عقل آ رہی ہے اور وہ سمجھنے لگی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ حق سے بچے کو محروم کرنا ظلم ہے بچہ پر بھی اور اپنے نفس پر بھی اور

اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ بچے کو اس کا حق ماں کی ماتا نہیں دیتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کا رحم دے رہا ہے، اس کی ربوبیت دے رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اب کچھ عقل دے دی ہے اور اکثر ڈاکٹر پھر اس طرف آ رہے ہیں کہ اگر ماں بچے کو دودھ نہ پلائے تو اس کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔ کیونکہ قدرت نے ایسا نظام قائم کیا ہے کہ اگر ماں بچے کو دودھ پلائے تو وہ بہت سی بیماریوں سے بچ جاتی ہے۔

پس توحید علمی سے انسان یہ معرفت حاصل کرتا ہے کہ عظمت ایک ہی ذات کی ہے اور ہر دوسرا انسان میرے جیسا عاجز انسان اور بے مایہ انسان اور ہر قسم کی قوت اور اہلیت سے خالی انسان ہے جس کو جتنی بھی طاقت ملی ہے وہ اس خدائے عظیم اور ربّ رحمٰن کی طرف سے ملی ہے جس نے ان تمام جہانوں کو پیدا کیا ہے۔

توحید عملی حقوق العباد سے تعلق رکھنے والی یہ ہے کہ حقیقی نیکی بجالانا یعنی دوسروں سے جو تعلقات ہیں وہ اسی اصول پر قائم ہونے چاہئیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو حق قائم کیا ہے وہ ادا ہو (پہلے یہ تھا کہ حق ادا ہونے چاہئیں) اب یہ ہے کہ حق ادا ہوں، صرف یہ نہ ہو کہ ہونے تو چاہئیں۔ بہت سے لوگ کہہ دیا کرتے ہیں (آپ کو بھی اپنی زندگی میں تجربہ ہوا ہوگا) بہت سی مشکلات ہیں نا۔ یا یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے۔ "سچی صحیح گل پر دیکھو نا بڑی مجبوریاں ہو جاندیاں نیں" (بعض مجبوریاں بھی ہوتی ہیں) ان مجبوریوں سے قتل بھی ہو جاتے ہیں۔ چوریاں بھی ہو جاتی ہیں۔ ڈاکے بھی پڑ جاتے ہیں اور حق تو وہ مان رہا ہوتا ہے۔

پس توحید علمی یہ تھی کہ حقوق ادا ہونے چاہئیں۔ توحید عملی یہ ہے کہ حقوق ادا ہونے شروع ہو جائیں۔ یہ دیکھ کر کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے انسانوں کے مجھ پر حقوق عاید کیے ہیں وہ ان حقوق اور ذمہ داریوں کو بجالائے اور اَصْلح طریق سے بجالائے۔ یعنی اس کے نتیجہ میں دوسرے کی قوتوں کی بہترین نشوونما ہو سکے۔ اور موحّد کی ان حقوق کے ادا کرنے میں یہ غرض نہیں ہوتی کہ دنیا میں اُس کی نیک نامی ہو، لوگ واہ واکہیں، تالیاں بجائیں، نعرے لگائیں، دنیوی طور پر اس کی وجاہت ہو جائے۔ یہ نہیں بلکہ موحّد کی صرف یہ غرض ہوتی ہے کہ اس کے اخلاق سراسر خدا تعالیٰ کے اخلاق میں فانی ہو جائیں اور فَنَا فِیْ اَخْلَاقِ اللّٰہِ کا مقام اُسے حاصل ہو جائے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے، اپنی مخلوق کے جو حقوق قائم کیے ہیں صفاتِ باری تعالیٰ کے پَرتو کے نیچے آ کر بہتر طریق پر وہ حقوق ادا ہو جائیں اور ہر فرد کی سب قوتیں اور استعدادیں اسی طرح سب اقوامِ عالم کی قوتیں اور استعدادیں اپنے نشوونما میں اپنے کمال تک پہنچ جائیں۔

پس عبادت کا تیسرا تقاضا یہ تھا کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ربّ العٰلمین ہوں۔ مَیں نے اپنی مخلوق پیدا کی ان کے اندر کچھ قوتیں پیدا کیں۔ اور یہ اصول قائم کیا کہ تدریجی ارتقا کے ذریعہ یہ قوتیں اور استعدادیں اپنے نشوونما کے کمال کو پہنچ جائیں۔ اس میں تدریجی ارتقا کے لیے اور دائرہ استعداد کے اندر کمال تک پہنچنے کے لیے جس جس چیز کی ضرورت تھی وہ میں نے پیدا کر دی اگر کسی کو وہ چیز نہیں ملتی تو اُس کا حق مارا گیا۔

پھر جو دوسرا اقتصادی تقاضا ہے (ہم اقتصادیات کی بات کر رہے ہیں) وہ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو نظام اقتصادیات میں جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے وہ نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو۔ یہ جو چرس کا مطالبہ ہے یا یہ جوئے کی کھیلیں ہیں۔ امریکہ ہی میں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں ان کے اڈے ہیں۔ پس یہ اقتصادی مطالبہ بڑی بھاری اکثریت کا ہے کہ ہمیں ہماری ENTERTAINMENT کے لیے، ہمارے نفسوں میں سکون پیدا کرنے کے لیے یہ سامان مہیا ہونے چاہئیں۔ یہ ہیں تو ہلاکت کے سامان لیکن وہ کہیں گے کہ یہ ہماری کھیلوں کے سامان ہیں۔ یہ ہماری دلچسپی کے سامان ہیں۔ یہ ہمیں ملنے چاہئیں ورنہ ہم مارے گئے، ہماری حق تلفی ہو گئی۔ بعض دفعہ باتوں باتوں میں یہ اقوام اس چیز میں بھی مقابلہ کر لیتی ہیں کہ ہم بڑے امیر ہیں ہمارا ایک عام مزدور ہفتہ میں دس بوتلیں شراب کی پیتا ہے اور تمہارا غریب ملک ہے تمہارے مزدور کو صرف چھ بوتلیں شراب کی ملتی ہیں (یہ چھ بھی لعنت اور وہ دس بھی لعنت۔ اسلام کا اقتصادی نظام تو شراب کے ایک قطرہ کا بھی روادار نہیں ہے) پس یہ مطالبہ غلط ہے یہ اطاعت کے اصول کے خلاف ہے۔ پچھلی عالمگیر جنگ میں انہوں نے کتنا گند مچایا تھا۔ حالانکہ یہ اقوام بڑی مہذب کہلاتی ہیں (اللہ تعالیٰ ان کو عقل دے) انہوں نے اپنی فوجیں جب غیر ملکوں میں ظلم اور تعدّی کے لیے بھجوائیں تو فوج کے ساتھ کنچنیوں کی فوج بھی جاتی تھی کہ بیچارے اپنی جان دینے کے لیے جا رہے ہیں جو فرصت کے اوقات ملتے ہیں ان میں وہ بدمعاشی کر کے سکون بھی نہ حاصل کریں۔ پس خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ اطاعت میری کرنی ہے، غیر اللہ کی اطاعت یا نفس کی خواہشات کی اطاعت نہیں کرنی اور تب ایک حسین معاشرہ اور ایک احسن اقتصادی نظام قائم ہوگا ورنہ نہیں ہوگا۔

عبادتِ حقیقی کا تیسرا تقاضا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا رنگ اپنے اخلاق پر چڑھاؤ۔ یہ توحید عملی کو قائم کرنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اصولاً عقلاً اور اگر کسی کو عرفان حاصل ہو تو عرفاناً یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اس عالمین اس دنیا کا بنیادی پتھر توحید باری تعالیٰ ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس کے بغیر انسان نہ اِس زندگی میں اور نہ اُس زندگی میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور اطاعت تب ہی ہو سکتی ہے جب تم اپنے اخلاق پر اللہ تعالیٰ کا رنگ چڑھاؤ گے۔ اگر تمہارے اخلاق پر اللہ تعالیٰ کا رنگ نہیں تو اطاعت کا دعویٰ اور اس بات کا دعویٰ کہ جو خدا تعالیٰ چاہتا ہے اس کی رضا کے لیے ہم بھی وہی چاہتے ہیں یہ غلط ہوگا۔

میں نے پچھلے خطبات میں بتایا تھا کہ اقتصادی نظام میں بھی ہمیں بنیادی طور پر چار صفات کام کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ باقی اور صفات بھی اس کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ مگر یہ چار صفات جو امہات الصفات کہلاتی ہیں اقتصادی نظام میں بھی یہی صفات بنیادی حیثیت کی حامل ہیں۔ یعنی اس میں صرف فروعی صفات جلوہ گر نہیں بلکہ اُمّہات الصفات بھی وہاں جلوہ گر ہیں۔ باقی صفات باری تعالیٰ جن کا انسان سے تعلق ہے وہ ان کے ساتھ مختلف رشتوں سے منسلک ہو کر جلوہ دکھاتی ہیں۔

خدا تعالیٰ کی صفت رُبوبیّت ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنی پہلی صفت بیان کی کہ مَیں ربّ العالمین ہوں اور ہمیں حکم دیا کہ ظلّی طور پر تمہیں بھی ربّ العالمین بننا پڑے گا اگر تم وہ اقتصادی نظام قائم کرنا چاہتے ہو جو مَیں قائم کرنا چاہتا ہوں۔

ربّ کی صفت ہمیں بتاتی ہے کہ کوئی شخص اچھا ہو یا بُرا اس کے ارتقا اور اس کی نشوونما کے لیے جن چیزوں کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے اُن سے اُسے محروم نہیں کیا۔ ابوجہل کو بھی دیا اور اس جیسے دوسروں کو بھی دیا۔ ہر ایک کو دیا وہ جو اللہ تعالیٰ کو گالیاں نکال رہے ہیں اُن کو بھی دیا (اس عطا کا وہ بہت جگہ غلط استعمال کرتے ہیں) لیکن اللہ تعالیٰ نے سامان پیدا کر دیئے ہیں وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ مجھے بُرا بھلا کہنے والے ہیں، میرا انکار کرنے والے ہیں اور جو توحید پر قائم ہیں اُن کو ہر قسم کا دُکھ پہنچانے والے اور ایذا دینے والے ہیں۔ وہ ان باتوں کا خیال نہیں رکھتا۔ رُبوبیّتِ عالمین کی صفت برابر جلوہ گر ہو رہی ہے۔ پھر اس ربوبیت کے ساتھ رحمانیت کا تعلق ہے، کیونکہ قوتوں اور استعدادوں کی نشوونما میں ایک وقت انسان پر ایسا بھی آتا ہے کہ بغیر کسی عمل کے احساناً اگر اُسے کوئی چیز نہ ملے تو اس کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔ موٹی مثال تو بچے کی ہے۔ بچّہ پیدا ہُوا تو اس نے کیا عمل کیا۔ کون سا حق اس نے اپنے عمل سے قائم کر لیا تھا کہ اس کو ماں کا دودھ ملے۔ کوئی بھی نہیں۔ بچہ پیدا ہوا ہے پہلی چیخ ماری ہے اس کی ماں کو اللہ تعالیٰ دودھ دے دیتا ہے کہ لے اس کو پلا۔ یہ رحمانیت کا جلوہ ہے۔

پس اسلام کے اقتصادی نظام میں ہر اس شخص کی ضرورت کا خیال رکھا گیا ہے کہ جس کی عملی زندگی ابھی شروع ہی نہیں ہوئی کہ اُس کو اجرت ملنے کا سوال پیدا ہو۔ اجرت ملنے کا ابھی سوال پیدا نہیں ہوا، ابھی اس نے کوئی کام ہی نہیں کیا۔ مثلاً ایک ذہین طالب علم ہے۔ اقتصادی نظام میں اس کی پڑھائی کا انتظام ہونا چاہیئے۔ اس کے ذہن کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہیئے اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اس کی ذہنی نشوونما کے لیے جن سامانوں کی ضرورت تھی وہ میں نے پیدا کر دیئے ہیں۔ اب اے زید، اے بکر، اے فلاں، اے فلاں غاصب اور ظالم بن کر اس کا جو حق ہے وہ مار نہ لینا۔ وہ ذہن بتا رہا ہے کہ اُس کے ذہن کی نشوونما کے سامان پیدا کیے گئے ہیں۔ پھر ایک شخص ہے اس کے (مسلز) MUSCLES اور اعصاب میں بیج کے طور پر اللہ تعالیٰ نے بڑی طاقت رکھی ہے اور وہ دنیا کا چوٹی کا پہلوان بن سکتا ہے۔ پس اگر اس کے اندر رستم پہلوان بننے کی طاقت اور قوت اور استعداد ہے تو اسے رستم پہلوان بننا چاہیئے۔ تا وہ اس طرح اسلام کی خدمت کر سکے۔ غرض ربُّ العالمین کا یہ اعلان ہے کہ اس قوت اور اس استعداد کو اس کے نشوونما کے کمال تک پہنچانے کے سامان مَیں نے اس دنیا میں پیدا کر دیئے ہیں وہ اسے ملنے چاہئیں۔ اسی طرح جس کو انجنیئر بننے کا دماغ ملا ہے اُس کو فلسفہ پڑھا کر اُس کے دماغ کو ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

ہمارے ملک میں بہت سے ذہن اس لیے ضائع ہو جاتے ہیں کہ اُن کو اُن کا حق نہیں ملتا، باپ کو صرف اتنا دیا کہ وہ فلسفی بنا سکے اور بیٹے کو اللہ میاں نے دماغ اتنا دیدیا کہ وہ انجنیئر بنے۔ سائنس اور آرٹس کے مضمونوں میں فیس کا فرق ہے۔ بعض ایسے خاندان بھی ہیں کہ جن کی مالی حالت ایسی ہے کہ وہ اس چھوٹے سے خرچ کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ باپ کہتا ہے عزیز من دل بھی کرتا ہے کہ تُو انجنیئر بنے، تُو حساب میں سو فیصدی نمبر بھی لیتا ہے لیکن میں کیا کروں میرے پاس فیس کے پیسے نہیں

حالانکہ خدا نے کہا تھا کہ اس کی فیس کے پیسے مَیں نے پیدا کیے ہیں ۔کوئی چور تھا جس نے اس کی فیس کے پیسے چرا لیے ۔ اور وہ چور ہمارا غیر اسلامی نظام ہے چاہے وہ کمیونزم کا نظام ہو یا سرمایہ داری کا نظام ہو۔ پس اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ جس طرح مَیں رب ہوں، مَیں نے ہر قوت کی نشوونما کے لیے استعداد پیدا کی اور سامان پیدا کیے ہیں تم اگر میری ظلیت میں رب بنو گے اور اس خُلق کا رنگ اپنے اوپر چڑھاؤ گے تب میری عبادت کا حق ادا کر سکو گے اور دنیا میں وہ نظام قائم ہو سکے گا، جو میں اقتصادی طور پر قائم کرنا چاہتا ہوں۔

پھر جیسا کہ مَیں نے ابھی مثالیں دی ہیں (رحمانیت اور رحیمیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فاتحہ میں یہ دعویٰ بھی کیا ہے (جس کو یہ لوگ بھول جاتے ہیں اور پھر اقتصادی ضرورت پوری نہیں ہوتی) کہ مزدور کی مزدوری صحیح طور پر مل جائے تب بھی اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ اس صورت میں تو صرف صفتِ رحیمیت کے جلوے کافی ہو جاتے کہ جتنا کسی نے کام کیا اُتنا اس کو مل گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ربّ کا جلوہ، رحمان ہونے کا جلوہ اور مالک ہونے کا جلوہ جو ہے وہ بھی ساتھ ساتھ ہونا چاہیئے۔ تب جا کر مزدور کی ضرورت کما حقہٗ پوری ہوتی ہے اور اُسے اس کا پورا حق ملتا ہے۔

مزدور کی ضرورت کیا ہے؟ میرا دعویٰ ہے کہ اسلام کے سوا کوئی اَور اس کا صحیح جواب نہیں دے سکتا۔ اس سوال کا جواب کسی بھی اِزم نے، کسی بھی اقتصادی نظام نے نہ دیا ہے اور نہ دے سکتا ہے۔ اسلام نے اس کا جواب دیا ہے اور اسلام ہی دے سکتا تھا۔

اسلام نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ہر مزدور ہر فردِ بشر کی ضرورت کی تعیین اس کی قوتیں اور استعدادیں کرتی ہیں پس اس کی قوت اور استعداد کی نشوونما کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے دراصل وہ اس کی ضرورت ہے اور وہی اس کا حق ہے۔ اسلام نے ضرورت کی یہ تعریف کی ہے اور چونکہ بعض UNITS افراد کے مجموعہ کے ہوتے ہیں اس لیے ہم کہیں گے ہر فرد کو، ہر خاندان کو اور ہر قوم کو (کیونکہ بین الاقوامی معاشرہ اور نظام جو ہے اس پر بھی یہ اصول اثر انداز ہوتا ہے) وہ سب کچھ ملنا چاہیئے کہ جو اُس قوت اور استعداد کے مطابق ہو، جو اللہ تعالیٰ نے اُسے عطا کی ہے۔ تاکہ اس کی صحیح نشوونما ہو سکے۔ یہ اس کی ضرورت اور حق ہے اور یہ تعریف آپ کو کہیں اَور نہیں ملے گی۔

بہرحال اللہ تعالیٰ رحیمیت کے ماتحت کہتا ہے کہ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میری سچی اور حقیقی عبادت کرو تو تمہاری زندگی میں دوسروں سے سلوک کرتے ہوئے میری رحیمیت کے جلوے، میری ظلّیت میں نظر آنے چاہئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مزدور کو جو اُجرت پر کام کر رہا ہے (دہاڑی پر ہو یا ہفتہ وار یا مہینہ یا سال کے بعد یا چھ ماہ کے بعد مختلف شکلوں میں دنیا میں اُجرتوں کی ادائیگی ہمیں نظر آتی ہے) اُسے پوری اجرت ملنی چاہیئے۔ بالفاظ دیگر اسلام یہ کہتا ہے کہ تمہاری اقتصادی زندگی میں میری رحیمیت کے جلوے نظر آنے چاہئیں کسی شخص کو اس کی اجرت کے حق سے کم نہ دیا جائے جیسا کہ مَیں نے ابھی بتایا ہے اس کی ضرورت پھر بھی بہت سے حالات میں پوری نہیں ہوگی۔ باقی ماندہ ضرورتوں کا اللہ تعالیٰ نے علیحدہ انتظام کیا ہے۔

لیکن بہر حال رحیمیت کے جلوے کا یہ تقاضا ہے کہ اُجرت کا جتنا کسی کا حق بنتا ہے اس سے کم نہ ملے۔

پھر مالک ہونے کا خُلق ہے۔ انسان حقیقی رنگ میں تو کسی چیز کا مالک نہیں۔ حقیقی مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی ظلّیت میں اسے مالک بھی بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو کہتا ہے کہ ساری دنیا کی چیزوں کا ہوں تو میں ہی مالک لیکن جس حدّ تک مَیں نے تمہیں طاقت دی ہے اُس حد تک میری ظلّیت میں مالک ہونے کی صفت اپنے اندر پیدا کرو اور یہ جو تفاوتِ استعداد کے نتیجہ میں کثرتِ اموال کی پیدائش ہوتی ہے اس کی صحیح تقسیم مالک ہونے کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ مالک ہے اس کی ظلّیت میں ہم نے جو کچھ لیا ہے ہمیں اپنے اخلاق اور اعمال میں اسی مالک ہونے کا جلوہ نظر آنا چاہیئے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہے تو میرا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جائز طریقے سے، حلال طریقے سے تم نے کمایا ہوا ہے، لیکن مالکیت کے جلوے اس کی تقسیم میں نظر آئیں گے۔ ایک صحابی کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ ایک لاکھ اونٹ خریدے۔ ایک اور دوست آ گئے انہوں نے کہا اسی قیمت پر میرے ساتھ سودا کر لو۔ انہوں نے کہا منظور ہے لیکن ایک شرط پر کہ ہر اونٹ کی نکیل مجھے دیدو۔ کہتے ہیں کہ نکیل کی قیمت اس وقت ایک اٹھنّی تھی، چنانچہ انہوں نے دو منٹ کے اندر پچاس ہزار روپیہ کما لیا۔ بعض لوگوں کے روشن ذہن اس طرح پر کام کرتے ہیں۔ وہ جائز کمائی تھی۔ ہمارے وہ بزرگ صحابی عجیب انسان تھے ویسا ہی ہر انسان کو بننا چاہیئے۔ جس وقت وہ پچاس ہزار روپیہ گھر میں لائے تو انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ مَیں اس کا مالک ہوں۔ انہوں نے سوچا کہ حقیقی مالک تو اللہ تعالیٰ ہے اس نے مجھے ایسی عقل دی کہ مَیں نے ایک دو منٹ کے سودے میں پچاس ہزار روپیہ کما لیا اور اب مَیں دیکھوں گا خدا تعالیٰ مجھے اس کے متعلق کیا حکم دیتا ہے کہ مَیں اسے کہاں اور کیسے خرچ کروں۔ یہ وہ طریق ہے جس کے مطابق ہر مسلمان کو خرچ کرنا چاہیئے اور اس طرز پر اسلامی مملکت کا منصوبہ بننا چاہیئے۔ یعنی مال حلال کمانے کی آزادی اور خرچ کرنے پر اسلامی پابندیاں اور جیسے اسلام کہتا ہے ویسے ہی حقوق کی کما حقّہٗ ادائیگی۔

پس مُخلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ میں دین کے تیسرے معنی کے لحاظ سے عبادت کا تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ خدا کا رنگ اپنے اوپر چڑھایا جائے۔ اس کی رُو سے اسلام کا اقتصادی نظام یہ فرض عائد کرتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی اُمّہات الصفات ہیں مثلاً اس کا ربّ ہونا، رحمان ہونا، رحیم ہونا اور مالک ہونا، ان کی ظلّیت کے طور پر (یعنی بطور ظل کے) یہی صفات ہمیں بھی اپنی زندگیوں میں ظاہر کرنی چاہئیں۔ اور اسی طرح اقتصادی زندگی میں بھی۔ کیونکہ وہ بھی ہماری زندگی کا ایک حصّہ ہے اس کو باہر نہیں رکھا جا سکتا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے متعلق بڑے زور سے اپنی جماعت کو یہ نصیحت بھی فرمائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

"جو شخص .... ہماری جماعت میں داخل ہو جائے اس کا پہلا فرض یہی ہے
کہ ...... یہی چاروں صفتیں (سورۂ فاتحہ والی) اپنے اندر بھی قائم کرے۔

ورنہ وہ اس دعا میں کہ اسی سورۃ میں پنجوقت اپنی نماز میں کہتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ یعنی اے ان چار صفتوں والے اللہ میں تیرا ہی پرستار ہوں اور تو ہی مجھے پسند آیا ہے، سراسر جھوٹا ہے۔ کیونکہ خدا کی ربوبیت یعنی نوعِ انسان اور نیز غیر انسان کا مربّی بننا اور ادنیٰ سے ادنیٰ جانور کو بھی اپنی مربّیانہ سیرت سے بے بہرہ نہ رکھنا یہ ایک ایسا امر ہے کہ اگر ایک خدا کی عبادت کا دعویٰ کرنے والا خدا کی اس صفت کو محبت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کو پسند کرتا ہے، یہاں تک کہ کمال محبت سے اس الٰہی سیرت کا پرستار بن جاتا ہے، تو ضروری ہوتا ہے کہ وہ آپ بھی اس صفت اور سیرت کو اپنے اندر حاصل کرلے تا اپنے مُحبّ کے رنگ میں آجائے۔

ایسا ہی خدا کی رحمانیت یعنی بغیر عوض کسی خدمت کے مخلوق پر رحم کرنا یہ بھی ایک ایسا امر ہے کہ سچا عابد جس کو یہ دعویٰ ہے کہ مَیں خدا کے نقشِ قدم پر چلتا ہوں ضرور یہ خلق بھی اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔

ایسا ہی خدا کی رحیمیت یعنی کسی کے نیک کام میں اس کام کی تکمیل کے لیے مدد کرنا یہ بھی ایک ایسا امر ہے کہ سچا عابد جو خدائی صفات کا عاشق ہے اس صفت کو اپنے اندر حاصل کرتا ہے۔ ایسا ہی خدا کا انصاف جس نے ہر ایک حکم عدالت کے تقاضا سے دیا ہے نہ نفس کے جوش سے، یہ بھی ایک ایسی صفت ہے کہ سچا عابد کہ جو تمام الٰہی صفات اپنے اندر لینا چاہتا ہے اس صفت کو چھوڑ نہیں سکتا اور راستباز کی خود بھاری نشانی یہی ہے کہ جیسا کہ وہ خدا کے لیے ان چار صفتوں کو پسند کرتا ہے ایسا ہی اپنے نفس کے لیے بھی یہی پسند کرے۔"

(تریاق القلوب صـ۳۹۰۔صـ۳۹۱ مطبوعہ ضیاء الاسلام پریس ربوہ)

اسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اِیَّاکَ نَعْبُدُ کی تفسیر کرتے ہوئے "اعجاز المسیح" میں تحریر فرماتے ہیں۔ یہ عربی میں ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:-

"اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ کسی بندہ کے لیے ممکن نہیں کہ اس وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ کی بارگاہ سے توفیق پانے کے بغیر عبادت کا حق ادا کرے اور عبادت کی فروع میں یہ بھی ہے کہ تم اس شخص سے بھی جو تم سے دشمنی رکھتا ہو ایسی ہی محبت کرو جس طرح اپنے آپ سے اور اپنے بیٹوں سے کرتے ہو۔ اور یہ کہ تم

دوسروں کی لغزشوں سے درگذر کرنے والے اور ان کی خطاؤں سے چشم پوشی کرنے والے بنو اور نیک دل اور پاک نفس ہو کر پرہیزگاروں والی صاف اور پاکیزہ زندگی گزارو اور تم بُری عادتوں سے پاک ہو کر باوفا اور باصفا زندگی بسر کرو اور یہ کہ خلق اللہ کے لیے بلا تکلّف اور بلا تصنّع یعنی نباتات کی مانند نفع رساں وجود بن جاؤ۔ اور یہ کہ تم اپنے کبر سے اپنے کسی چھوٹے بھائی کو دُکھ نہ دو اور نہ کسی قول اور بات سے اس کے دل کو زخمی کرو۔ بلکہ تم پر واجب ہے کہ اپنے ناراض بھائی کو خاکساری سے جواب دو اور اسے مخاطب کرنے میں اس کی تحقیر نہ کرو اور مرنے سے پہلے مرجاؤ اور اپنے آپ کو مُردوں میں شمار کرلو اور جو کوئی تمہارے پاس آئے اس کی عزّت کرو خواہ وہ بوسیدہ کپڑوں میں ہو نہ کہ نئے جوڑوں اور عمدہ لباس میں۔ اور تم ہر شخص کو السلام علیکم کہو خواہ تم اسے پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو اور انسان کی غمخواری کے لیے ہر دم تیار کھڑے رہو۔"

عبادت کے مختلف تقاضوں کی طرف جماعت کو نصیحت کے رنگ میں متوجہ فرمایا ہے۔

بہرحال اس وقت میں یہ مضمون بیان کر رہا ہوں کہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ جو اقتصادی نظام دنیا میں وہ قائم کرتا ہے کوئی دوسرا اقتصادی نظام اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اور اس کی دلیل دیتے ہوئے اس کی خوبیوں اور اس کے حُسن کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ دیکھو! ہمارا قائم کردہ اقتصادی نظام ان خوبیوں کا، اس حسن کا، ان احسانوں کا حامل ہے۔ یہ باتیں تم دوسرے نظاموں میں بھی تو دکھاؤ۔ اگر ہم اقتصادی مسائل کا اور دنیا نے اُن کے جو حل پیش کیے ہیں، حقوق اگر دیئے ہیں تو وہ اور اگر غصب کیے ہیں تو وہ، اس لحاظ سے دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ساری دنیا میں ہمیں اس قدر بھیانک ظلم پھیلا ہوا نظر آتا ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں جب بھی مسلم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کی اور اس کی اطاعت کا جُوا اپنی گردن پر رکھا۔ اس نے ایک ایسا معاشرہ قائم کیا کہ غیر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ان کو فائدہ مل رہا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ مَیں ربّ العالمین ہوں۔ مَیں نے دنیا کو سمجھانے کے لیے ایک مثال بھی دی یعنی خدا تعالیٰ نے کہا میں ابوجہل کو کھانا دیتا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ میرا بندہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میری صفات کا کامل رنگ اپنی صفات پر رکھتا ہے۔ اچھا میں قحط پیدا کردیتا ہوں پھر دیکھو جو بندہ میرے رنگ میں رنگین ہے وہ تمہیں کھانے کو دیتا ہے یا نہیں اگر وہ کھانے کو دیتا ہے تو ثابت ہوا کہ مَیں ہی تمہیں کھانے کو دے رہا تھا۔ اگر وہ نہ دے تو پھر تمہارا اعتراض صحیح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کھانے کو نہیں دے رہا تھا بلکہ بُت دے رہے تھے۔ ایک انتہائی سخت قحط پیدا کردیا اور اس کے ذریعہ خدا تعالیٰ نے گردنیں اکڑا کر چلنے والوں اور سارے عرب میں یہ اعلان کرنے والوں

کی کہ ہم تلواروں سے اسلام کو نیست و نابود کر دیں گے گردنیں جھکا دیں، انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگا کہ ہم بھوکے مر رہے ہیں کھانے کو دو۔ اس وقت آپؐ کا عمل اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک جلوہ تھا اور وہ جلوہ اس رنگ میں نظر آیا کہ آپ نے ان کے لیے کھانے کا انتظام کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اصل حقیقت توحید باری تعالیٰ ہے۔ وہی کھانا دے رہا تھا لیکن بُت پرست کہتے تھے کہ نہیں ہمارے بُت دے رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ جو میری توحید کو قائم کرنے والا، میری صفات کے جلوے دکھانے والا اور میرے اخلاق کے رنگ میں دنیا کے اخلاق کی تربیت کرنے والا ہے اس کا ایک جلوہ تمہیں دکھا دیتے ہیں اور ہر عقلمند سمجھ جائیگا کہ جب ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کو مل رہا تھا تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل رہا تھا۔ وہی رب العالمین ہے۔

غرض اسلام نے اپنے اقتصادی نظام کی بنیاد سب سے پہلے ربوبیت عالمین پر رکھ کر ہر انسان کو، ہر مخلوق کو اسلام کی تعلیم کے زیر احسان کر دیا، پھر حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنی ہے۔ دنیا کے دباؤ تم پر پڑیں گے، تم نے جرأت سے اُن کا مقابلہ کرنا ہے اور ہر حالت میں فنا فی اخلاق اللہ کے مقام کے حصول کے لیے مجاہدہ کرنا ہے۔ پس ہر چیز جو ہمیں نظر آتی ہے وہ خدا تعالیٰ کے کسی نہ کسی حکم کو پورا کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے، حقوق کی ادائیگی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ مثلاً یہ حکم ہے کہ تیرا ہمسایہ بھوکا نہ رہے۔ ایک شخص کو زیادہ دیا ہے گھر میں جو دانہ ہے اس کا ایک حصّہ وہ ہے کہ جس سے خدا کا حکم پورا کرنا ہے، یا یہ حکم ہے کہ اپنے بچے کو اس کے ذہن کے مطابق تعلیم دلواؤ۔ کئی ظالم ماں باپ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی مالی حالت ایسی ہوتی ہے کہ اگر وہ تھوڑی سی قربانی کریں تو وہ بچے کو پڑھا سکتے ہیں لیکن وہ قربانی نہیں کرتے اور کہہ دیتے ہیں کہ رات کو کلب جانے کا خرچ برداشت کریں یا بچے کو پڑھائیں۔ وہ کہتے ہیں نہیں جی ہم کلب کا خرچ کریں گے بچہ بے شک پڑھے یا نہ پڑھے۔ چنانچہ بعض ماں باپ میٹرک یا ایف اے یا بی اے یا بی ایس سی کے بعد بچوں کی پڑھائی چھڑوا دیتے ہیں کہ اگر ایف ایس سی یا بی ایس سی کریگا تو میڈیکل کالج میں جائے گا زیادہ خرچ ہوگا۔ یا کہتے ہیں کہ ایم اے پڑرک جا حالانکہ اس کا دماغ کہیں زیادہ ترقی کر سکتا تھا۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ ہم آگے نہیں پڑھائیں گے کیونکہ ان کی عیش و عشرت کی زندگی پر یہ پڑھائی اثر انداز ہوتی ہے۔

غرض ہر مخلوق، ہر چیز جو خدا تعالیٰ نے پیدا کی ہے وہ اپنے کسی حکم کے پورا کرنے کے لیے ہے اس معنی میں کہا جاتا ہے کہ ہر دانے پر لکھا ہوتا ہے کہ یہ کس کے پیٹ میں جانا ہے ——— ہم مسلمان احمدیوں کو حقائق اشیاء کے علم کے حصول کے لیے گہری فکر کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ یہ محض فلسفہ نہیں ہے ایک حقیقت ہے۔ پس ہر چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے کسی نہ کسی حکم کی بجا آوری کے لیے پیدا کی ہے۔ اور اس کا جو استعمال ادائیگی حق میں نہیں ہوتا وہ غلط استعمال ہے۔ خدا کے غضب کا مورد بن جاتا ہے۔ یہ کہنے والے کہ ہمارے مزدور زیادہ شراب پیتے ہیں زیادہ سینما دیکھ سکتے ہیں۔ ایک دن میں کسی کے پاس تین تین دفعہ سینما دیکھنے کے پیسے ہوتے ہیں یا وہ عیاشی اور بدمعاشی اور بداخلاقی میں اپنا پیسہ دوسروں کی نسبت زیادہ خرچ کر سکتے ہیں۔ یہ ہم سنتے چلے آئے ہیں۔ اب وہی قومیں تباہی کے گڑھے پر کھڑی ہیں۔ انھیں نظر آ رہا ہے کہ وہ تباہ ہو گئے ہیں اور ہمارے جو چھوٹے

بچے ہیں (خدا کرے بڑوں کو بھی اتنی زندگی عطا ہو) انہیں یہ نظارہ نظر آ جائے گا کہ وہ قومیں تباہ ہو گئیں جو ساری دنیا کو اپنا غلام بنانے لگی تھیں۔ اسلام نے کہا کہ غلام صرف ایک کا بننا ہے کسی غیر کی غلامی نہیں ہے۔ اسلام کا اقتصادی نظام غیر کی غلامی سے چھڑوانے والا ہے اور خدائے واحد و یگانہ کی غلامی جو نہایت اچھی غلامی ہے اور خوشحال غلامی ہے اور مسرّتوں اور خوشیوں سے لبریز غلامی ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس غلامی کی زندگی، اس اطاعت کی زندگی میں باندھ دیا ہے۔ اگر وہ سمجھے اور عقل سے کام لے۔ غرض اسلام کے اقتصادی نظام کی بنیاد ان چار صفات پر ہے اور سارا اقتصادی نظام اس پر چل رہا ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے صرف اسلام ہی نے فرد اور خاندان اور قوم کی ضرورت کی تعیین اور تعریف کی ہے اور اس کو محدود کیا ہے اور اس سے زائد کے جو مطالبے ہیں اسلام ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ ایک شخص جس کو میٹرک تک پڑھنے کا ذہن دیا ہے اگر صحیح اسلامی حکومت ہو تو اگرچہ وہ امیر گھرانہ ہی میں کیوں نہ پیدا ہوا ہو اُسے میٹرک کے بعد گیارھویں میں داخلہ نہ ملے گا۔ اس کا دماغ ہی نہیں ہے۔ یہ نظام سارے کا سارا منصوبہ بندی پر قائم ہے اور اس کے بغیر چل نہیں سکتا۔ اور بڑا تفصیلی جائزہ لینا پڑیگا۔ پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ اپنی طاقت اور حالات کے مطابق جائزہ لے لیتے تھے وہ کافی تھا اب دنیا کے حالات بدل گئے۔ جب بھی یہ اقتصادی نظام قائم ہوا اس کی بنیاد بہت زیادہ STATISTICS پر ہوگی۔ تب ساری ضرورتوں کی تعیین ہوگی۔ ہر بچے کے ٹسٹ ہونگے کہ کہاں تک اس کا دماغ ترقی کر سکتا ہے اور کن کن LINES پر یہ چل سکتا ہے پھر ان LINES پر ان کو چلایا جائے گا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ قانون چل رہا ہے کہ ایک چنگا بھلا انسان ۴۰۔۴۵ سال کی عمر میں بعض دفعہ وفات پا جاتا ہے، بعض بچے صحت مند ہوتے ہوئے چھوٹی عمر میں مر جاتے ہیں یہ اس کا اور قانون چل رہا ہے۔ غرض اس قسم کے بھی ذہین بچے ہونگے جو اپنی ذہانت کو کمال تک نہیں پہنچا سکیں گے۔ لیکن وہ بچّہ جس کو اللہ تعالیٰ زندگی دے گا اس کو اسلام کا اقتصادی نظام اللہ تعالیٰ کے فضل سے توفیق بھی دیگا کہ وہ اپنی ذہنی قوتوں کو اُجاگر کرتا چلا جائے اور ان کی نشو و نما اس کے کمال تک پہنچ جائے۔ اور اسلام نے ہر شخص اور ہر خاندان کی ضرورت کی تعریف یہ کی ہے کہ میں رب العالمین ہونے کی حیثیت میں جو قوتیں اور استعدادیں پیدا کرتا ہوں ساتھ ان کے سامان بھی پیدا کرتا ہوں اس واسطے ہر فرد اور ہر خاندان اور ہر قوم کی قوتوں اور استعدادوں کو انتہائی کمال تک نشو و نما کے ادوار میں سے گذارتے ہوئے پہنچانے والی ضرورت وہ ضرورت ہے جو ہر فرد کی ضرورت اور ہر خاندان کی ضرورت اور ہر بچے کی ضرورت اور ہر بڑے کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کے مطابق اس سے سلوک کرنا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں جب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا تھا، رحمانیت کے بڑے حسین جلوے نظر آتے ہیں۔ آپ کو چھوٹے چھوٹے بچوں کا خیال ہوتا تھا حالانکہ ابھی ان کا عمل تو شروع نہیں ہوا تھا۔ نہ اسلام کے حق میں ان کی قربانیاں تھیں، پھر مالک ہونے کا جلوہ کہ قربانی باپ نے دی اور آگے صلہ بچوں کو مل گیا۔ یہ مالک ہی کر سکتا ہے نا یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہی کر سکتا ہے نا! خدا کی امانت تھی، وہی حقیقی مالک ہے اور اسی نے کہا کہ میں یہ اصول وضع کرتا ہوں،

اس کے مطابق تم خرچ کیا کرو۔ اس میں غیر بھی شامل ہے اور تمہارے نفس کا بھی حق ہے۔ اس سے کم اگر کوئی تمہیں دینا چاہے تو ظالم ہے۔ جیسا کہ روس میں کمیونزم نے امیروں کو اُن کے حقوق سے محروم کر دیا۔ یہ اتنا ہی ظلم ہے جتنا غریب کو اس کے حقوق سے محروم کرنا ظلم ہے، ان دو ظلموں میں کوئی فرق نہیں۔ جو ایک امیر کا حق ہے بحیثیت انسان کے، بحیثیت رب العالمین کی ایک مخلوق کے، بحیثیت ان قوتوں اور استعدادوں کے جو اسے رب العالمین نے دی ہیں۔ اس کا جو حق ہے وہ اس کو ملنا چاہیئے۔ کوئی امیر گھرانے میں پیدا ہو اور چاہے کوئی غریب گھرانے میں پیدا ہو۔ لیکن کوئی "ازم" تو غریب کی پروا نہیں کرتا اور کوئی "ازم" امیر کی پروا نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ازم اللہ تعالیٰ کی عطا کے ایک حصّہ کو ٹھکراتا اور کُفرانِ نعمت کرتا ہے، لیکن اسلام کا اقتصادی نظام اللہ تعالیٰ کی ہر عطا سے صحیح فائدہ اُٹھاتا ہے، شکرانِ نعمت کرنے والا ہے۔ خدا کرے کہ ہم اُس کے شکر گذار بندے بنیں۔

(الفضل ۶ ظہور/اگست ۱۳۴۸ ہش/۱۹۶۹ء)

اِقتصادِیات

پر

اثر انداز ہونے والی

آفاتِ نفس

سے

بچنے کا حکم

خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۱ وفا/جولائی ۱۳۴۸ ہش/۱۹۶۹ء

"نفس کی بہت سی آفات ہیں، جن کا اثر بالواسطہ یا بلا واسطہ اسلام کے اقتصادی نظام پر پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفس کی ہر آفت کا ذکر قرآنی تعلیم میں کیا ہے اور اس سے بچنے کا حکم بھی دیا ہے اور ساتھ ہی اس سے بچنے کا طریق بھی بتایا ہے۔ قرآن کے تمام نواہی کا تعلق اسی سے ہے۔ ان آفاتِ نفس کا تعلق چونکہ انسانی زندگی کے ساتھ ہے اور چونکہ اقتصادیات بھی انسانی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، اس لیے اقتصادیات سے بھی ہے۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے یہ آیہ کریمہ پڑھی

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ

(البینۃ آیت ۶)

اس کے بعد حضور نے فرمایا:-

اس سلسلہ خطبات میں مَیں اسلام کے اقتصادی نظام پر روشنی ڈال رہا ہوں اور مَیں بتا رہا ہوں کہ اسلام کے اقتصادی نظام سے تعلق رکھنے والے تمام احکام (اوامر ونواہی) اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کے لیے دیئے گئے ہیں۔ مَیں نے بتایا تھا کہ حقیقی اور خالص عبادت کے گیارہ تقاضے مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ میں بیان ہوئے ہیں۔

خالص عبادت کا چوتھا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی آفات کو سمجھے اور نفس امارہ کے بُرے اور گندے میلانوں کو سمجھ کر ان کا قلع قمع کرنے کی کوشش کرے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے توحید کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ہمیں بتایا ہے کہ توحید چھ قسم کی ہوتی ہے۔ مَیں نے اس کا ذکر ذرا تفصیل سے پچھلے ایک خطبہ میں کیا تھا۔ مَیں نے بتایا تھا کہ ایک قسم کی توحید وہ ہے جو انسان کے نفس کے حق کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور پھر آگے اس کی دو قسمیں ہیں ایک حق نفس کے ساتھ تعلق رکھنے والی توحید علمی اور دوسری حق نفس کے ساتھ تعلق رکھنے والی توحید عملی۔ حق نفس سے تعلق رکھنے والی توحید علمی یہ ہے کہ انسان نفس کی کمزوریوں اور نفس کے عیوب اور نفس کی آفات اور نفس کے رذائل کا علم رکھے۔ اور حق نفس سے تعلق رکھنے والی توحید عملی یہ ہے کہ ان آفات نفس سے بچنے کی کوشش کرے۔ نفس امارہ کے مطالبوں سے مغلوب نہ ہو بلکہ غالب ہو کر نفس لوامہ کی ہدایتوں کے ماتحت نفس مطمئنہ کی تلاش میں زندگی کے دن گذارے اور پھر اسے حاصل کرے۔ حق نفس سے تعلق رکھنے والی اس توحید کو ہم ورع یا زہد و تعبّد کا نام بھی دیتے ہیں۔ یعنی ان آفات کو جاننا اور ان سے بچنے کی کوشش کرنا، اور ان پر غالب آنا۔ نفس کی آفات کا بڑا گہرا تعلق اقتصادیات سے بھی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کو نظر انداز کر دیا جائے اور نفس کی خواہشات کی پیروی کی جائے تو ایک ایسا اقتصادی نظام قائم ہوتا ہے جو انسانیت کے لیے تباہ کن ثابت ہوتا اور اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے کا موجب بنتا ہے۔

نفس کی پہلی آفت ظلم ہے۔ ظلم کے لغوی معنی یہ ہیں کہ اپنے نفس کے جو حقوق ہیں ان سے زائد طلب کرنا اور جو غیر کے

حقوق ہیں ان کو روکنا اور ان کو ادا نہ کرنا، یہ ہر دو کام یعنی دوسرے کی حق تلفی اور اپنے لیے حق سے زیادہ چاہنا اور حاصل کرنا یہ ظلم ہے کیونکہ یہ ہر دو وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّہٖ کے دائرہ کے اندر آتے ہیں۔

اِس ظلم کے نتیجہ میں بہت سی اقتصادی بُرائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے اُن کا وضاحت سے ذکر کرکے ان سے منع فرمایا ہے بلکہ اس کو لعنتی ذہنیت قرار دیا ہے کہ انسان اپنا حق تو اصل حق سے زائد سمجھے اور دوسرے کے حق کو اس کے اصل حق سے کم سمجھے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ یاسین میں فرماتا ہے:

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ قَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ

اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰہُ اَطْعَمَہٗ۔ (آیت ۴۸)

فرمایا کہ دنیا میں بعض لوگ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری یعنی کفرانِ نعمت کرنے والے ہوتے ہیں۔ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی نعمتوں سے نوازا اور رزق عطا کیا ہے اس رزق اور ان نعمتوں کو ان حقوق کے مطابق خرچ کرو جن کو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی حق قائم نہیں کیا۔ ہم خود حقوق کو قائم کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے حق کو قائم کرنا تھا تو محتاج اور اپنے حق سے محروم نظر آنے والوں میں سے اللہ تعالیٰ کسی کو بھی محتاج و محروم نہ رکھتا۔ وہ خود ان کے حقوق ادا کر دیتا۔

پس ایسے لوگ دوسروں کے حقوق کے متعلق اس اصل سے انکار کرتے ہیں کہ دنیا میں تمام حقوق اللہ تعالیٰ ہی قائم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ایسی ذات نہیں جو کسی کا حق قائم کرنے کی مجاز ہو۔ کیونکہ اس نے ہمیں پیدا کیا اور اسی نے ہمیں قوتیں اور استعدادیں عطا کیں اور پھر ان کی نشو و نما کے سامان بھی پیدا کیے۔ پس اللہ تعالیٰ ہی ہے جو پیدا کرتا ہے وہی ہر ایک کو بہتر جانتا اور وہی ہر ایک کے حق کو قائم کر سکتا ہے۔ کسی دوسرے کو تو نہ ان قوتوں اور استعدادوں کا علم ہے نہ کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مخلوق باری تعالیٰ کے حقوق کے متعلق کوئی فیصلہ کرے۔ مگر یہ ناشکرے لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے اموال میں دوسروں کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو عزت و اکرام کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ عزت و اکرام کی نشانی اور علامت جانتے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ فجر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰہُ رَبُّہٗ فَاَکْرَمَہٗ وَنَعَّمَہٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَکْرَمَنِ ○ (آیت ۱۶)

کہ جب اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے بعض کو آزمانا چاہتا ہے تو ایک خاص قسم کی ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے اور اس آزمائش سے ان کے لیے عزت اور وجاہت کے حصول کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ انہیں نعمتوں سے نوازتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ اگر تم اس رزق کو اور ان نعماء کو میری ان ہدایتوں کے مطابق خرچ کرو گے تو میری نگاہ میں تم معزز بن جاؤ گے۔ بعض لوگ تو اس بات کو سمجھتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں کہ جو اس راز کو سمجھتے ہی نہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ

رَبِّیْٓ اَکْرَمَنِ یعنی میرے اندر کچھ اس قسم کی ذاتی خوبیاں ہیں کہ میرا رب بھی میری عزت و اکرام کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ حالانکہ ان کو یہ نعماء اس لیے دی گئی تھیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ان کو جائز طور پر خرچ کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں عزت و اکرام کو حاصل کریں۔ لیکن وہ اس بات کو سمجھتے نہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یتیم کی عزت نہیں کرتے مسکین کے حقوق ادا نہیں کرتے اور جو مال انہیں ملتا ہے نہ صرف وہ مال جسے وہ خود کماتے ہیں بلکہ وہ مال بھی جسے وہ ورثہ میں پاتے ہیں جس کی کمائی میں ان کی کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس سارے مال اور خدا تعالیٰ کی عطا کردہ باقی نعمتوں کا بھی غلط استعمال کرتے ہوئے اسے وہ عیش و عشرت میں اُڑا دیتے ہیں۔ وہ مال سے انتہائی محبت کرتے ہیں، اس کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں۔ اس کی پرستش شروع کر دیتے ہیں اور اُس مال کی خاطر اللہ تعالیٰ کو ٹھکرا دیتے ہیں اور دنیا کی اس عارضی عزت کی خاطر ابدی طور پر عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے کے شرف سے خود کو محروم کر لیتے ہیں۔ حالانکہ جب اللہ تعالیٰ کی عزت کی نگاہ انسان پر پڑ جاتی ہے تو انسان ہر قسم کی مسرتوں کا وارث بن جاتا ہے۔

پس نفس کی پہلی اور بنیادی آفت یہ ظلم ہی ہے گو باقی آفاتِ نفس بھی ظلم ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان شکلوں کو ہم نے مختلف نام دیئے ہیں۔ کیونکہ ہر آفت کا تعلق یا تو اپنے حق سے زائد لینے یا حق سے کم دینے سے ہے۔

نفس کی دوسری آفت حرص یعنی لالچ ہے۔ مثلاً مال سے بہت زیادہ محبت کرنا سورۂ فجر کی مذکورہ بالا آیت کے بعد اس سورۃ کے آخر میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

تُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (آیت ۲۱)

اس خصلت رذیلہ کے نتیجہ میں اقتصادی دنیا میں دو زبردست اور ہلاکت کی طرف لے جانے والی بُرائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان مال کے لالچ کے نتیجہ میں احتکار کرتا ہے، یعنی اس کے پاس جو اشیا اور اموال فروخت کے لیے ہوتے ہیں وہ اُن لوگوں کو جنہیں اُن کی ضرورت ہوتی ہے قیمتاً بھی نہیں دیتا بلکہ ان کو روکے رکھتا ہے اور اس طرح مخلوقِ خدا کو تکلیف میں ڈالتا ہے۔ حالانکہ ان لوگوں کا یہ حق خدا تعالیٰ نے قائم کیا تھا کہ اس سامان کو جو اللہ تعالیٰ نے اس وقت پیدا کیا اس میں سے اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے خریدیں۔ لیکن یہ شخص لوگوں کو ان کی ضرورت کے وقت خریدنے کے حق سے محروم کر دیتا ہے اور مال کو روک رکھتا ہے۔ اور اس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے اور یہ لالچ کار فرما ہوتا ہے کہ اس طرح محدود و معیّن دائرہ میں قحط کے آثار پیدا ہوں گے اور وہ زیادہ قیمت پر مال کو بیچ کر فائدہ اٹھائے گا۔ اس طرح حرص کے نتیجہ میں وہ دوسرے کو اس کے حقِ خرید سے محروم کر دیتا ہے۔ اسلام نے اس سے سختی سے منع کیا ہے۔

دوسرے اس حرص اور لالچ کے نتیجہ میں ہمیں اقتصادیات کے اندر ایک ظلم عظیم نظر آ رہا ہے اور وہ سود ہے کیونکہ اس سُود کے نتیجہ میں آج دنیا کی جو شکل عملاً ہمیں نظر آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے ایک چھوٹے سے گروہ کے پاس دنیا کے سونے اور چاندی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔

سود سے اقتصادی غلامی پیدا ہوتی ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے نظام کو جاری کیا ہے جس طرح سُود بنی نوع انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کا ایک عظیم منصوبہ ہے اسی طرح نظام زکوٰۃ اس اقتصادی غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے کا ایک عظیم حربہ ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے نفس کی اس آفت سے بھی انسان کو اسلام کے اقتصادی نظام کے ذریعہ بچایا ہے کیونکہ فرمایا ہے احتکار نہیں کرنا، سود نہیں لینا، بلکہ اس کے مقابلہ میں زکوٰۃ کو ادا کرنا ہے تاکہ اس طرح لوگوں کے وہ حقوق ادا ہو جائیں جن کو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے ویسے زکوٰۃ کے INSTITUTION (نظام) کے نتیجہ میں ہر فرد واحد کے اقتصادی حقوق پورے طور پر ادا نہیں ہو سکتے۔ تاہم بہت سے افراد کے اقتصادی حقوق ادا ہو جاتے ہیں اور جو حقوق ادا نہیں ہوتے ان کی ادائیگی کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دوسرے احکام دیئے ہیں۔

نفس کی تیسری آفت حسد ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمنّا اور خواہش رکھنا کہ وہ شخص جو کسی نعمت کا مستحق ہے اُس سے وہ نعمت چھن جائے اور اس کے لیے کوشش بھی کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بڑی تفصیل سے یہ ہدایت دی ہے کہ حسد نہیں کرنا اور تاکیداً فرمایا ہے کہ جن لوگوں کے پاس میری نعمتوں میں سے تمہیں کچھ نظر آتا ہے اور مَیں نے ان کا یہ حق قائم کیا ہو کہ یہ نعمتیں ان کے پاس رہیں کیونکہ وہ اِن کا استحقاق رکھتے ہیں تو اُن کے متعلق تمہارے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے ان کا جو حق قائم کیا ہے اس سے وہ محروم ہو جائیں اور نہ ہی اس کے لیے تمہیں کبھی کوشش کرنی چاہیئے۔

نفس کی چوتھی آفت جو اقتصادیات پر بڑا گہرا اثر ڈالتی ہے وہ بُخل کی آفت ہے۔ بُخل کے معنے بھی حق کو ادا نہ کرنے کے ہیں۔ کیونکہ بخل یہ ہے کہ کسی چیز کو دوسرے کو دینے سے روکے رکھنا، جس کے روکے رکھنے کا اُسے کوئی حق نہ تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ زید کا بکر پر اللہ تعالیٰ نے ایک حق قائم کیا تھا اور بکر یہ حق ادا کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اس کو بخل کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ بخل کی آفت فخر و مباہات کے منبع سے سَر ابھارتی ہے، اور بُخل سے پرہیز کرنے کا بہترین طریق یہ ہے کہ فخر و مباہات سے اجتناب کیا جائے۔

پس بخل کے معنے یہ ہوئے کہ کسی کا حق تھا اور یہ حق کسی دوسرے پر تھا، لیکن جس پر حق تھا وہ یہ حق حقدار کو ادا نہیں کر رہا۔ اللہ تعالیٰ سورۃ آل عمران میں فرماتا ہے:۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ
خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (آیت ۱۸۱)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بخیل کے لیے اس کا بُخل اچھے نتائج پیدا نہیں کرے گا یہ اس کے لیے خیر کا موجب نہیں ہوگا۔ بعض قومیں

بڑی بخیل ہیں اگر آپ ان کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے تاریخی ادوار میں اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی لعنتوں کی وارث بنتی رہی ہیں۔ خیر کی وارث کبھی نہیں بنیں۔ کیونکہ فرمایا ہے بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ اس بخل کا نتیجہ خیر ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ ان کی بعض دنیوی ترقیات کے لیے، ان کے ذہنی نشو و نما کے لیے، ان کی اخلاقی ترقیات کے لیے اور ان کی روحانی ترقیات کے لیے بُرا نتیجہ نکلے گا اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو نیک قوتیں اور استعدادیں عطا کی ہیں وہ اس رنگ میں اپنے نشو و نما کے کمال کو نہیں پہنچ سکیں گی کہ اللہ تعالیٰ کی محبّت اور اس کی رضا کو حاصل کر سکیں۔ بلکہ ان کا یہ بخل اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت کا موجب بنے گا اور انہوں نے بخل کی وجہ سے دوسروں کے حقوق ادا نہ کر کے جو اموال یا سونا اور چاندی وغیرہ جمع کیے ہیں وہ ان کے کسی کام نہیں آئیں گے وہ ان کے گلے کا طوق بنا دیئے جائیں گے اگرچہ ایسا اس دن ہوگا جس دن اللہ تعالیٰ ان کی اس تباہی کا فیصلہ کرے گا، تاہم اس دُنیا میں بھی بعض قوموں کی تباہی کا وقت قریب آ رہا ہے اور احمدیت کی ترقی کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ تمہارا کوئی حق اس پر نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور جو حقیقی مالک ہو یہ اسی کا کام ہے کہ وہ بتائے کہ جو اس کی چیزیں ہیں وہ کس کو کس رنگ اور کس طریق سے پہنچنی چاہئیں۔ بعض دفعہ وہ خود ایسا انتظام کرتا ہے کہ حق دار کو اس کا حق مل جاتا ہے یا بعض دفعہ پورا نہیں تو ایک حد تک حقدار کو اس کا حق مل جاتا ہے۔ یعنی کلّی طور پر اپنے حقوق کے لینے میں وہ محروم نہیں رہتا۔ لیکن بعض دفعہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیے ایسے سامان پیدا کرتا ہے کہ حق تو زید کا ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ بکر کو دے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اے بکر! یہ تیرا حق نہیں یہ تو میں نے تیری ترقی کے لیے سامان پیدا کیے ہیں کہ تو جس کا حق ہے اسے پہنچا دے۔ جو چیز تیری نہیں تھی، جو چیز کسی دوسرے کی تھی اگر میرے کہنے پر میری رضا کے حصول کے لیے بخل سے بچتے ہوئے تُو یہ چیز اس کے حقدار کو پہنچا دیگا تو تیرا اس میں کوئی نقصان نہیں کیونکہ درحقیقت یہ چیز تیری تھی ہی نہیں، البتہ اس میں تیرے لیے بہت فائدہ ہے۔ کیونکہ اس طرح تم میری رضا کو، میری محبت کو، تم میرے پیار کو اور ہر اس خیر کو جس کا منبع میں ہوں اور ہر اس فیض کو جس کا سرچشمہ میں ہوں پا لو گے۔

بخل کے نتیجہ میں انسانی فطرت اس طرف بھی مائل ہو جاتی ہے کہ جب انسان ماپ اور تول والی چیزوں کو لینے لگتا ہے تو زیادہ لیتا ہے۔ یعنی دوسرے کے حق کو چھیننے کی کوشش کرتا ہے اور جب اسے کوئی چیز دینے لگتا ہے تو کم تول کر یعنی کم اور چھوٹے پیمانے سے اس کو ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے سورۃ انعام میں ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ (آیت ۱۵۳)

کہ ماپ اور تول کو تم حق و انصاف کے ترازو پر تولا کرو۔ اس میں صرف کیل اور میزان ہی نہیں بلکہ معنی کے لحاظ سے ہر ایک چیز کا پیمانہ مراد ہے مثلاً باہمی معاہدات ہوتے ہیں کہ اس قسم کی چیز دینی لینی ہے جیسے مثلاً روئی ہے تو اس قسم کی روئی ہو۔ گندم ہے تو اس قسم کی گندم ہو۔ ویسے اب گندم کی بھی بہت سی قسمیں نکل آئی ہیں تاہم لین دین میں اس معاہدہ کی اصل

روح کو مدِنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ قومیں جو اپنے عہد و پیمان کو انصاف سے پورا کرنے والی نہیں ہوتیں وہ اقتصادی لحاظ سے کبھی نہیں ابھریں۔

قرآن کریم میں یہ بھی آتا ہے کہ کچھ ایسے لوگ ہیں کہ

اِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ (سورۃ المطففین آیت ۴)

کہ جب تول کر دیتے ہیں یا وزن کرتے ہیں یا پیمائش کرتے ہیں یا ایک معیار مقرر کرتے ہیں تو اس معیار پر پورے نہیں اُترتے، مثلاً ہاکی ایک کھیلنے کی چیز ہے۔ پچے اس مثال کو سمجھ جائیں گے۔ اگر کسی کالج نے درجنوں کے حساب سے ہاکیاں خریدنی ہیں اور دکان دار ایک معیاری ہاکی انہیں دکھاتا ہے، لیکن اگر بعد میں وہ اس معیار کی ہاکیاں نہ دے تو یہ چیز بھی اسی آیت کے نیچے آجاتی ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے اسلام کے اقتصادی نظام کو ایسا بنایا ہے کہ بُخل اس میں کوئی مفسدانہ کھیل کھیل ہی نہیں سکتا۔ بلکہ بُخل کے نتیجہ میں جو مختلف شکلوں کی حق تلفی ہو سکتی تھی اسلام کے اقتصادی نظام میں اس حق تلفی کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔

نفس کی پانچویں آفت ریا ہے، یعنی دکھاوے نمائش کے لیے کام کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے جو اقتصادی اصول وضع کیے ہیں ان میں ریا اور نمائش کی بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔ جو لوگ ریا سے کام لیتے اور نمائش یعنی دکھاوے کے لیے کام کرتے ہیں وہ اپنے اصل حقوق سے زیادہ خرچ کر رہے ہوتے ہیں یا زیادہ حاصل کر رہے ہوتے ہیں کیونکہ کسی فردِ واحد کی قوتوں اور استعدادوں کی صحیح اور کامل نشو و نما کے لیے ریا اور نمائش کی ضرورت نہیں ہے۔ عقل بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتی اور مذہب اسلام بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور ہر وہ چیز جس کی فردِ واحد یا خاندان یا قوم یا اقوام کی قوتوں اور استعدادوں کی صحیح اور کامل نشو و نما کے لیے ضرورت نہ ہو اس کی اسلام کے اقتصادی نظام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

قرآن کریم میں نمائش کرنے والوں اور دکھاوے کے طور پر کام کرنے والوں کا بھی ذکر موجود ہے اور پھر اُن پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا بھی اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کے متعلق فرماتا ہے:

اَھْلَکْتُ مَالًا لُّبَدًا (البلد آیت ۷)

کہ ایسا انسان کہے گا میں نے ڈھیروں ڈھیر مال خرچ کر دیا۔ یہیں اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا ہے کہ مال خرچ کرنا فی نفسہٖ کوئی نیکی نہیں ہے۔ حق کی ادائیگی میں مال خرچ کرنا نیکی ہے۔ کسی کو کوئی چیز دینا نیکی نہیں ہے بلکہ کسی کا اصل حق ادا کرنا نیکی ہے اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ اگر کسی کا مال اس لیے خرچ ہوا ہے کہ اس طرح بعض لوگوں کے حقوق ادا ہو جائیں تو یہ ایک نیکی کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس طرح تم میری رضا کے وارث بن جاؤ گے۔ لیکن اگر تمہارا خرچ اس وجہ سے نہیں اپنے مال کو تم اس مقصد اور اس غرض کے لیے خرچ نہیں کرتے بلکہ تم مال کو محض نمائش اور

دکھاوے کے لیے خرچ کرتے ہو جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ میرے پاس بڑا مال ہے اور اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہو کہ تمہارے پاس جو مال ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے لوگوں کے حقوق قائم کیے ہیں اور تجھے وہ مال اِس لیے دیا گیا ہے کہ تُو دوسروں کے ان حقوق کو ادا کرکے اللہ تعالیٰ کے فضلوں اور رحمتوں کا وارث بنے لیکن تُو اس چیز کو بھول جاتا ہے اور بڑے فخر سے کہتا ہے کہ مَیں نے نمائش کے طور پر بے تحاشا مال خرچ کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بعض بیوقوف اور بصارت اور بصیرت سے محروم شاید اس کے نتیجہ میں تیری تعریف بھی کر دیں لیکن اللہ تعالیٰ کی تعریفی نگاہ تجھ پر نہیں پڑ سکتی اور نہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے تجھ سے عزّت و احترام کا سلوک کر سکتے ہیں۔

اس آیت کے آگے جو آیات ہیں ان میں دو اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حق کی ادائیگی دو طرح کی ہوتی ہے ایک غلامی سے چھڑانے کے لیے اور دوسری غربت کو دُور کرنے کے لیے۔ ان ہر دو کا اِس حق کی ادائیگی سے تعلق ہے۔ غلامی سے صرف وہی غلامی مراد نہیں جو ایک وقت تک بڑی بھیانک شکل میں دنیا میں رائج رہی ہے اور اب بھی نیم ظاہری شکل میں غلاموں کی نسلیں امریکہ میں ہمیں نظر آتی ہیں۔ غلامی کا طوق بظاہر ان کی گردن میں نہیں ہوتا، لیکن دنیا کا کوئی عقلمند اور خدا ترس انسان ان کو آزاد بھی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ وہ مختلف قوانین میں، مختلف روایات میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مختلف نفرتوں مختلف حقارتوں اور مختلف حق تلفیوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

ایک اَور غلامی بھی ہے جو اگرچہ اس طرح کی غلامی تو نہیں لیکن وہ غلامی ضرور ہے۔ کیونکہ ہر وہ شخص جو ایک ایسے ماحول میں پرورش پا رہا ہے کہ مال کے علاوہ جو اس کے دوسرے حقوق ہیں وہ اُسے نہیں مل رہے وہ بھی تو غلام ہے وہ بھی جکڑا ہوا اور قید ہے، وہ آزاد نہیں، کیونکہ وہ اس چیز میں آزاد نہیں کہ وہ اپنی قوتوں اور استعدادوں کے مطابق صحیح نشو و نما پا سکے۔ اس لیے وہ غلام ہی ہے خواہ دنیا اس کو غلام سمجھے اور اس کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے کی کوشش کرے اور خواہ دنیا اس کو غلام نہ سمجھے اور اُس کی غلامی کی زنجیروں میں اُسے جکڑا رکھنے کی کوشش کرے بہر حال اس کی غلامی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت اچھا ذہن دیا ہے لیکن اس کا ماحول اس کے ذہن کی کماحقہٗ نشو و نما نہیں ہونے دیتا، وہ تو درحقیقت غلام ہی ہے اس کے ہاتھ تو بندھے ہوئے ہی ہیں۔ وہ باوجود احساس رکھنے کے اپنی قوتوں کی نشو و نما نہیں کر سکتا اور بعض دفعہ وہ اپنی غلامی کا احساس ہی نہیں رکھتا۔ چنانچہ فرانس کے ایک سیاسی مفکّر نے شاید اسی حقیقت کے پیش نظر ایک جگہ لکھا ہے:

"A SLAVE IS TO BE FORCED TO BE FREE"

یعنی ایک غلام کو زبردستی آزاد بنانا پڑے گا کیونکہ اسے اپنی غلامی کا احساس نہیں۔ اس مفکّر کی منطق اور فلسفہ کے بعض حصوں سے تو اسلام اختلاف رکھتا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض دفعہ غلام کو اپنی غلامی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اسلام نے پہلے اُسے غلامی کا احساس دلایا ہے۔ پھر اس کی آزادی کے لیے ہر قسم کے سامان پیدا کیے ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے سورۃ بلد کی

ان آیات میں فرمایا ہے کہ مال کو ڈھیروں ڈھیر خرچ کردینا کوئی خوبی نہیں ہے، خوبی یہ ہے کہ اموال کو اس رنگ میں خرچ کیا جائے کہ دنیا سے ہر قسم کی غلامی مٹ جائے۔ وہ غلامی بھی جو ایک بھیانک شکل میں نظر آتی ہے اور وہ غلامی بھی جو بہت سی آنکھوں سے پوشیدہ رہتی ہے اور بعض دفعہ اس غلام کی آنکھ سے بھی پوشیدہ رہتی ہے اور اسے اپنی غلامی کا خیال ہی نہیں ہوتا۔ لیکن ہر قسم کی غلامی دور ہونی چاہیئے اس معنی میں کہ ہر آدمی اس بات میں آزاد ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کے اندر اپنی استعدادوں کی نشوونما کو کمال تک پہنچا دے پس اللہ تعالیٰ نے رزق کی تقسیم میں عزت و احترام کے حصول کا سامان رکھ دیا ہے۔ یعنی ایک شخص کو مال دیدیا ہے۔ سارے مال پر جس کا حق نہیں اور دوسرے کو براہِ راست نہیں دیا جس کے حق کو اس نے قائم کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں سے کہا کہ جن کو میں نے ان کے نفس کے حقوق سے زائد یعنی ہر ایک کے نفس کے بھی تو کچھ حقوق ہیں دیا ہے۔ وہ ان کا نہیں ہے۔ میرے کہنے پر میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میری رضا کے حصول کے لیے، میری محبت کو پانے کے لیے اس زائد مال کو ان لوگوں کو دیدو جن کے حقوق کو میں نے اسلامی شریعت میں قائم کیا ہے کیونکہ اس طرح تم میری نگاہ میں عزت کو حاصل کرلوگے۔

پس ہر قسم کی غربت کو دُور کرنے اور ہر قسم کی غلامی سے انسان کو چھڑانے کے لیے تھوڑا یا بہت مال حق کی ادائیگی میں خرچ کیے جانے کا اسلام نے حکم دیا ہے۔ اسلام میں اس کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں تم میری رضا کو حاصل کرسکو گے۔ لیکن اگر یہ دو مقاصد مدنظر نہ ہوں حق کی ادائیگی سامنے نہ ہو بلکہ صرف یہ خیال ہو کہ اگر میں نمائش کے طور پر مال کو خرچ کرونگا تو دنیا میں میری واہ واہ ہوگی اور دنیا کی بصارت و بصیرت سے محروم آنکھ مجھے غلط قسم کی عزت دیدیگی تو یاد رکھنا چاہیئے کہ نمائش کی غرض سے مال کے خرچ کرنے کے نتیجہ میں انسان کو کبھی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل نہیں ہوسکتی۔

اسی طرح نفس کی اور بہت سی آفات ہیں جن کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ اسلام کے اقتصادی نظام پر پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفس کی ہر آفت کا ذکر قرآنی تعلیم میں کیا ہے اور اس سے بچنے کا حکم بھی دیا ہے اور ساتھ ہی اس سے بچنے کا طریق بھی بتایا ہے قرآن کے تمام نواہی یعنی یہ نہیں کرنا۔ یہ نہیں کرنا وغیرہ کا تعلق اسی سے ہے۔ ان آفات نفس کا تعلق چونکہ انسانی زندگی کے ساتھ ہے اور چونکہ اقتصادیات بھی انسانی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے اقتصادیات سے بھی ہے۔ چند موٹی موٹی آفاتِ نفس اور نفسِ امّارہ کے میلان جو نمایاں طور پر اقتصادیات پر اثر انداز ہوتے ہیں اُن کا میں نے اس وقت ذکر کردیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کا قائم کردہ اقتصادی نظام سرمایہ داری یا اشتراکیت کے قائم کردہ اقتصادی نظام سے بہت مختلف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ میں خالص اور حقیقی عبادت کا پانچواں تقاضا یہ بتایا تھا کہ احکام یعنی اوامر و نواہی خالصۃً للہ ہوں اوامر کی پیروی کی جائے اور نواہی سے بچا جائے۔ دراصل آفاتِ نفس سے بچنا اور اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا رنگ اپنے اوپر چڑھانا (جو اللہ تعالیٰ کی خالص عبادت کا تیسرا تقاضا تھا) ممکن نہیں یعنی یہ دونوں تقاضے پورے نہیں ہوسکتے

جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم جاری نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جس بات کا حکم دیا ہے وہ کی جائے اور جس بات سے روکا ہے وہ بات نہ کی جائے اور اقتصادیات میں بھی (مثلاً ابھی میں نے پانچ آفتوں کا ذکر کیا ہے) ان آفتوں سے اسی صورت میں بچا جاسکتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرے اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کی جائے اور دین کے تمام تقاضوں کو پورا کیا جائے تو دنیا میں ایک حسین اقتصادی نظام قائم ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے پچھلے خطبہ میں بھی بتایا تھا اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ جس قسم کے اقتصادی نظام کو وہ قائم کرنا چاہتا ہے وہ ہر اس اقتصادی نظام سے اعلیٰ اور برتر ہے۔ جسے کوئی انسان یا کوئی قوم یا ساری اقوام مل کر بھی دنیا میں قائم کرنا چاہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقتصادی نظام میں جہاں تک مستحقین یا محرومین کی جن کو حقوق نہیں مل رہے ضرورتیں پوری کرنے کا سوال ہے۔ اسلام کسی کی ضرورت کے پورا کرنے کے سوال کو اٹھاتا ہی نہیں بلکہ ہر ایک کے حق کو ادا کرنے کا سوال اٹھاتا ہے۔ ان دونوں میں حقیقتاً بڑا فرق ہے۔ جو آدمی ضرورت پوری کروانا چاہتا ہے وہ فقیر بن جاتا ہے جیسا کہ آپ نے سفر کرتے ہوئے دیکھا ہوگا کہ جب کسی جگہ بس یا کار یا ریل ٹھہرتی ہے تو بھیک منگا سامنے آجاتا ہے اور کہتا ہے میں صبح سے بھوکا ہوں مجھے کچھ کھانے کو دو۔ ضرورت اس نے پیش کی بھیک منگا بن گیا نا! پس باقی سارے نظاموں نے محروم کو فقیر اور بھیک منگا بنا دیا ہے۔ پھر دوسری بات یہ بھی ہے کہ ان نظاموں نے ضرورت کا نام بھی لیا مگر اس کی تعریف نہیں کی۔ اس کی وضاحت نہیں کی کہ ضرورت سے کیا مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اقتصادی نظام میں جسے وہ قائم کرنا چاہتا ہے ضرورت کی بجائے حق کے تصوّر کو پیش کیا ہے یعنی ہر فرد واحد کے جو حقوق ہیں وہ ادا ہونے چاہئیں جس نظام میں ہر ایک کے حقوق ادا نہیں ہوتے وہ نظام درحقیقت غاصب ہے کیونکہ کسی کی صرف ضرورت کا ذکر کرکے اس کے سارے حقوق کو پورا نہ کرنا دراصل اسے محتاج اور فقیر اور بھیک منگا بنانے کے مترادف ہے اس کے مقابلہ میں اسلام کے اقتصادی نظام نے نہ صرف ضرورت کو تسلیم کیا ہے بلکہ ہر شخص کے اصل حق پر زور دیا ہے۔ اور ضرورت کی بڑی لطیف تعریف کی ہے اور کسی نظام نے ایسی تعریف نہیں کی۔ اسلام کے اقتصادی نظام میں ضرورت سے مراد یہ ہے کہ ہر فرد واحد کے جو حقوق ہیں وہ ادا ہونے چاہئیں۔ اگر وہ ادا نہیں ہوتے تو وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہے اس کے غضب کے نیچے ہیں۔ کیونکہ اُن کے اموال میں اللہ تعالیٰ نے دوسروں کا حق رکھا تھا جسے وہ ادا نہیں کر رہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے ہر انسان کو جو قوت اور استعداد بخشی ہے اس کی نشوونما کو اس کے کمال تک پہنچانے کے لیے جس چیز کی بھی ضرورت ہے وہ اس کا حق ہے۔ عام اقتصادی نظاموں میں کہا جاتا ہے کہ جو ضروریات زندگی ہیں وہ دے دو۔ اسلام کہتا ہے کہ نہیں اس سے کام نہیں چلے گا۔ دوسرے نظام جب دینے پر راضی بھی ہوتے ہیں تو کم سے کم دینے پر راضی ہوتے ہیں۔ اسلام کا اقتصادی نظام کہتا ہے کہ کم سے کم نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ دینا چاہیئے یعنی نشوونما کو کمال تک پہنچانے کے لیے دینا ہے اور اس سے زیادہ کچھ اور ہو نہیں سکتا ورنہ اسراف ہو جائے گا اور اسراف ایسی چیز ہے کہ اس کا حق خدا تعالیٰ نے قائم نہیں کیا۔

اسی طرح جو امیر ہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول کی زبان سے کہلوایا ہے" وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقٌّ" ہم تیرا حق بھی قائم کرتے ہیں کیونکہ تیرے حق کی تعیین یہ ہے کہ تیرے اور تیرے خاندان کے جو قویٰ ہیں، جو طاقتیں اور استعدادیں ہیں ان کو کمال تک پہنچانے کے لیے نہیں جن چیزوں کی ضرورت ہے ہم نہیں دیتے ہیں اور جو اس سے زائد ہے اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا کے اندر آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہاری عیاشیوں کے جو اخراجات ہیں وہ تمہارا حق نہیں۔ کیونکہ تمہاری قوت، قابلیت، طاقت اور استعداد کی نشو ونما کے لیے ان کی ضرورت نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے امیر کا جو حق تسلیم کیا ہے غریب اس سے چھین نہیں سکتا جیسا کہ اشتراکیت نے ظلم کرتے ہوئے امرا سے اُن کا حق چھین لیا۔

پس اسلام کے اقتصادی نظام میں امیر کا بھی حق قائم کیا گیا ہے اور غریب کا بھی حق قائم کیا گیا ہے۔ مانگنے کو بُرا سمجھا اور اپنی بحث میں اس چیز کو نہیں لایا اور کہا ہے کہ خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ مَیں نے ہر شخص کا حق قائم کیا ہے وہ حق اس کو ملنا چاہیئے۔ اگر افراد اس حق کو نہیں دیتے، اگر وہ طوعی طور پر اس حق کو پورا نہیں کرتے تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ حق دار کو اس کے حقوق دلوائے۔ آگے اس کے لیے بڑی محنت اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے جس کا ذکر خود "الدّین" میں بیان ہوا ہے۔ اس پر بحث انشاء اللہ بعد میں ہو جائے گی۔

(الفضل ۸ اخاء/اکتوبر سن ۱۳۴۸ ہش/۱۹۶۹ء)

ہر عادت

اللہ کے حکم اور فرمان

کے

مطابق ہونی چاہیئے

خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۸ وفا (جولائی) ۱۳۴۸ ہش/۱۹۶۹ء

"تمہاری ہر عادت اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کے حکم کے تابع اور ہر برائی کے خلاف جنگ کرنے والی ہونی چاہیئے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی تو پابندی کرتا ہوں، لیکن میری عادتیں، میری خواہشات اور میری مرضی کے مطابق ہوں گی۔ تو ایسا شخص پورے طور پر متقی نہیں کہلا سکتا۔ نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ کا پیار حاصل کر سکتا ہے۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تشہد و تعوّذ اور سُورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

پچھلے چند خطبات سے مَیں اسلام کے اقتصادی نظام کے متعلق سلسلہ وار ایک مضمون بیان کر رہا ہوں۔ مَیں بتا چکا ہوں کہ انسان اپنے پیدا کرنے والے ربّ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور حقیقی اور خالص عبادت انسان سے گیارہ تقاضے کرتی ہے جن کا ذکر قرآن کریم کی ایک آیت کے اس ٹکڑا میں بیان ہوا ہے کہ

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (البیّنۃ ۹۸: ۶)

دین کے گیارہ معنے یہاں چسپاں ہوتے ہیں۔ چونکہ خالص عبادت انسان کے ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتی ہے اس لیے ان گیارہ کے گیارہ تقاضوں کا تعلق اسلام کے اقتصادی نظام سے بھی ہے۔

پانچ تقاضوں کے متعلق مَیں اس سے قبل بتا چکا ہوں صحیح اور حقیقی عبادت کا چھٹا تقاضا یہ ہے کہ عادت اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہو۔ کیونکہ "اَلدِّیْن" کے معنے "اَلْعَادَۃ" کے بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اس کی نشوونما کے لیے ایک قوت یہ بھی رکھی ہے کہ وہ اپنے اندر جسمانی اور روحانی مدارج کے حصول کے لیے عادتِ صحیحہ پیدا کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو یہ قوت عطا ہونا واقعی اس پر بڑا رحم ہے۔

روحانی لحاظ سے مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو مخلصین کی جماعت ملی تھی جماعت احمدیہ میں داخل ہونے سے قبل اُنہیں خدا تعالیٰ اور اسلام کے لیے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے قیام کے لیے ایک آنہ خرچ کرنے کی بھی عادت نہیں تھی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن کو مالی قربانی دینے کی عادت ڈالنی شروع کی۔ ابتدا میں بعض لوگوں نے خدا تعالیٰ کی راہ میں ایک چونّی دی اور آپ نے ان کا نام اپنی کتاب میں لکھ دیا چنانچہ اب قیامت تک اُن کی وہ قربانی یاد رکھی جائے گی۔ شاید نئی نسل یہ پڑھ کر حیران ہو کہ اس سے زیادہ تو اطفال اپنے جیب خرچ سے بچا کر دے دیتے ہیں اس لیے کیوں اس وقت کی قربانی کو اتنی اہمیت دی گئی کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتابوں میں ان کا ذکر کر کے ان لوگوں کو ایک ابدی زندگی عطا کی۔ جس کے نتیجہ میں قیامت تک ان کی نسلیں ان کے لیے دعائیں کرتی اور ان پر درود بھیجتی رہیں گی۔ دراصل یہ اہمیت اس لیے دی گئی کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دھیلا خرچ کرنے کی بھی عادت نہیں تھی ان کے لیے تو چونّی بھی بڑی چیز تھی اور پھر یہی لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد زندگی دی اور جن کے لیے ان کی صحیح تربیت کے نتیجہ ہیں، صحیح عادتیں پیدا ہو جانے کی وجہ سے رفعتوں کا حصول بڑا آسان ہو گیا تھا۔ انہوں نے خدا تعالیٰ کی راہ میں قربانیوں پر قربانیاں دیں۔ مگر خدا تعالیٰ اور اس کے بندے پر احسان نہیں جتایا بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم فضل سمجھا۔

غرض انسان کی صحیح نشوونما کے لیے عادت ایک بڑی ضروری چیز ہے۔ پہلوان جب ڈنڈ پیلتے ہیں تو وہ اپنے شاگردوں کو کہتے ہیں کہ پہلے پانچ ڈنڈ نکالو اور پھر دس بیس دفعہ۔ غرض جُوں جُوں جسم کو اُن کی عادت پڑتی جاتی ہے تُوں تُوں ڈنڈ پیلنے کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس سے ہمیں یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ کسی موقع پر بھی یہ نہ سمجھ لینا کہ اس وقت تمہاری قوتوں کی جو حالت ہے وہ اس کا کمال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ فرمایا ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ (البیّنۃ ۹۸:۶)

کہ تم میں ہر عادت جو پیدا ہو وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے ماتحت ہو۔ فرمانِ الٰہی کے ماتحت ہو۔ انسان کو بحیثیت انسان مختلف قسم کی جو قوتیں اور قابلیتیں عطا کی گئی ہیں اس کی عادات ان کی نشوونما میں مُمد ہوں۔ انہیں ہلاکت کی طرف لیجانے والی نہ ہوں۔ انسان کو نیکی اور بدی کی اجازت و اختیار کے نتیجہ میں اس کے اندر اچھی اور بُری ہر دو قسم کی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بُری عادات سے بچنا اور نیک عادات پیدا کرنا حقیقی اور سچّی عبادت کے لیے ضروری ہے۔

ایک بہت بُری عادت جسے بعض مخفی ایسوسی ایشنز (ASSOCIATIONS) نے بعض اوقات میں بعض جگہوں پر جان بُوجھ کر اُن لوگوں کو تباہ کرنے کے لیے جن کو وہ اپنا مخالف سمجھتی تھیں یا جن کو تباہ کرنے میں وہ اپنا فائدہ دیکھتی تھیں اس قسم کی عادت پیدا کرنے کے لیے کوشش کی ہے۔ یہ نکمّا پن کی عادت تھی۔ میرے نزدیک نکمّے پن کی تعریف یہ ہے کہ انسان کے قوٰی پر اُتنا بوجھ نہ ڈالنا جتنا بوجھ وہ اپنی نشوونما کے اُس مخصوص دور میں برداشت کر سکتا ہے۔ یہ بوجھ بتدریج بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ممکن ہے بعض قسم کے بوجھ آخری عمر میں گھٹتے ہی چلے جائیں۔ لیکن بہر حال جسمانی طور پر (روحانی طور پر تو وہ نہیں گھٹتے) نشوونما کے ابتدائی دَور میں یہ بوجھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن کسی کا اپنی قوت اور قابلیت پر اتنا بوجھ نہ ڈالنا جتنا وہ نشوونما کے اس دَور میں یا اس مخصوص وقت میں برداشت کر سکتا تھا، یہ نکمّا پن ہے۔ بوجھ کا ایک حصّہ وقت سے تعلّق رکھتا ہے کہ اتنا وقت کام کرو۔ اب یہ تو درست ہے کہ ہر آدمی کے کام کی نوعیّت مختلف ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لیے اُس کو ایک طاقت دی ہے۔ پس جتنا زیادہ سے زیادہ بوجھ وہ برداشت کر سکتا ہو (اپنے وہم کے نتیجہ میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت کے نتیجہ میں) اُتنا وقت اپنے کام میں خرچ کرنا چاہیئے۔ اگر وہ اُتنا وقت خرچ نہیں کریگا تو وہ اُس کام میں زیادہ قوت لگا نہیں سکے گا۔ دنیا کے کاموں میں تو شاید ہم ٹھہر جائیں۔ لیکن روحانی طور پر تو اوقات بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ انسان کسی اور رنگ میں کسی اور طرف سے کچھ بچاتا ہے اور ادھر دے دیتا ہے۔

پس نکمّا پن ایک نہایت ہی مُہلک چیز ہے۔ یہ عادت روحانی لحاظ سے بھی، اخلاقی لحاظ سے بھی اور (ہم چونکہ اس وقت

اقتصادیات کی بات کر رہے ہیں اس لیے) اقتصادی لحاظ سے بھی بڑی ہی مہلک ہے۔ فرض کریں ہم نے کسی چیز کی پیداوار معلوم کرنے کے لیے سال یُونٹ مقرر کیا ہے، اس اعتبار سے کسی فرد یا خاندان یا ملک کی سال کی مجموعی پیداوار اس کی دولت متصوّر ہو گی۔ یہ کاغذ پر پرنٹ کیے ہوئے نوٹ (روپے) اصل دولت نہیں، بلکہ کسی فرد یا کسی خاندان کی یا کسی ملک کی دولت وہ پیداوار ہے جو ایک سال کے اندر ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک کے باشندے اپنے اوقاتِ کار میں سے بیس۲۰ فیصدی ضائع کر دیتے ہیں، بیکار بیٹھے گپّیں ہانکتے رہتے ہیں، سینما میں چلے جاتے ہیں اور دوسری قسم کے شوز (SHOWS) دیکھنے لگ جاتے ہیں اور اپنے اصل کام کی طرف کما حقّہٗ توجہ نہیں دیتے تو اس ملک کی پیداوار سَو۱۰۰ کی بجائے اسّی۸۰ رہ جاتی ہے۔ اس پر اگر وہ شور مچائیں کہ ہماری ساری ضرورتیں پوری کرو، تو ظاہر ہے کہ جب انہوں نے وہ چیز پوری پیدا ہی نہیں کی، تو کس طرح سب کی ضرورتیں پوری اور سب کے حقوق ادا ہو سکتے ہیں۔

اگر ایک طالب علم روزانہ بارہ گھنٹے کی بجائے یا دس گھنٹے پڑھنے کی بجائے صرف تین گھنٹے پڑھائی کرے اور باقی وقت ضائع کر دے۔ اگر فرض کریں ہمارے کالجوں میں ایک لاکھ طالب علم ہوں تو اِس طرح نکمّے پن کی وجہ سے روزانہ تعلیم کے نو لاکھ گھنٹے ضائع ہوئے۔ یعنی انہوں نے اپنی پڑھائی کے اوقات میں سے ۷۵ فیصدی حصّہ نکمے پن کی وجہ سے ضائع کر دیا۔ پس ایک ایسی قوم جس کے طالب علم اتنے کاہل ہوں وہ ایک ایسی قوم سے جس کے بچے اپنے اوقات میں سے بمشکل ایک فیصدی وقت ضائع کرتے ہوں (کوئی نہ کوئی استثنا تو ہر جگہ ہوتا ہے) دنیوی اعتبار سے کیسے مقابلہ کر سکتی ہے۔

آکسفورڈ میں جو طالب علم کلاس کی پڑھائی کے علاوہ دس بارہ گھنٹے روزانہ پڑھتا تھا وہ پڑھائی میں بڑا اچھا طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ اور جو طالب علم روزانہ اوسطاً سات آٹھ گھنٹے پڑھتا تھا اس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ درمیانے درجے کا طالب علم ہے جبکہ چار پانچ گھنٹے روزانہ پڑھائی کی اوسط بنانے والے طالب علم کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ بڑا آوارہ ہے اس کو پڑھائی کی طرف توجہ نہیں، لیکن ہمارے ملک میں روزانہ چار پانچ گھنٹے کی اوسط سے پڑھنے والا ٹاپ (TOP) کے سکالرز (SCHOLARS) میں شمار ہوتا ہے۔

پس اگر معیار میں یہ فرق ہو تو اس محنتی قوم کے ساتھ ہمارے بچے ان تمام اچھے ذہنوں کے باوجود جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کیے ہیں کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ نکمّے پن کی عادت بنیادی طور پر بڑی مہلک ہے۔ اور اقتصادیات پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ پیداوار اور پیداوار کی تیاری اس سے شدید متاثر ہوتی ہے۔ مَیں نے طالب علم کی مثال دی ہے اور وہ اقتصادی مثال ہی ہے کیونکہ وہ مستقبل کی پیداوار کی تیاری ہے اگر ہم ٹیکنیشن (TECHNICIAN) نہیں بنائیں گے اگر ہمارے ہاں انجنیئرز (ENGINEERS) طالب علم نہیں ہونگے، اگر ڈاکٹر نہیں ہونگے، اگر وکیل نہیں ہونگے۔ اگر پولی ٹیکنیکس (POLYTECHNICS) میں پڑھنے والے نہیں ہوں گے اور جو ہونگے وہ وقت ضائع کرنے والے ہوں گے تو ہماری پیداوار کیسے سو فیصدی ہو گی۔

غرض یہ طالب علمی کا زمانہ اقتصادی پیداوار کی تیاری کا زمانہ ہے۔ یعنی اس نسل نے آگے جا کر اپنے اپنے فن، مہارت اور کوشش کے نتیجہ میں اقتصادی طور پر کچھ پیدا کرنا ہے۔ یا اس نے مادّی چیزیں پیدا کرنی ہیں جیسے کارخانوں میں کپڑے بُنتے ہیں یا اس نے سروسز (SERVICES) پیدا کرنی ہے۔ جیسے ڈاکٹر کی سروس ہے، وکیل کی سروس ہے۔ اقتصادی زبان میں ان سروسز کو کموڈی ٹی (COMMODITY) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سروسز اقتصادیات کا ایک باقاعدہ حصّہ ہیں۔ پس اقتصادی میدان میں بھی نکمّے پن کا پیدا نہ ہونے دینا ایک اہم اور بنیادی چیز ہے۔

اس نکمّے پن کی عادت کی اصل محرک اور سب سے بڑا سبب بعض تخریب پسند خفیہ انجمنیں ہیں۔ جس طرح انسان کی پیدائش کے وقت سے شیطان اس کے ساتھ لگا ہوا ہے اسی طرح یہ انجمنیں بھی ہزاروں سال سے تخریبی کام کرتی چلی آرہی ہیں جہاں بھی ان کو موقعہ ملتا ہے وہ اپنا کام کرتی چلی آرہی ہیں۔ اس سلسلہ میں بیسیوں نہیں، بلکہ سینکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں میں صرف ایک مثال دے دیتا ہوں۔ وہ بھی پُرانی ہے تاکہ کسی کو اپنی طرف خیال نہ چلا جائے۔

یہ ۱۸۲۲ء کی بات ہے، ایک خفیہ انجمن کے ایک لیڈر نے جس کا نام PETIT TIGRE تھا، اپنے ایک ماتحت افسر کو جو کسی دوسری جگہ خفیہ کام کر رہا تھا ایک ہدایت نامہ بھجوایا۔ اس ہدایت نامہ کا پہلا حصّہ اس نکماپن کی مثال سے تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن اس حصّہ کو بھی سن لیں تو اچھا ہے۔ شاید یہ کسی وقت میرے بھی اور آپ کے بھی کام آجائے۔ وہ لکھتا ہے:

"It is essential to isolate the man from his family and cause him to lose his morals"

کہ دنیا میں ہم جو شرارت اور تباہی مچانا چاہتے ہیں اور جو تخریبی کارروائی کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو اس کے خاندانی بندھنوں سے آزاد کر دیا جائے۔ اور اس کے اندر بداخلاقی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

ایک تو یہ ہدایت تھی، دوسرے جہاں سے مَیں نے یہ اقتباس لیا ہے وہاں اس نے پہلے کچھ الفاظ چھوڑے ہوئے ہیں یعنی ڈاٹس (DOTS) ڈالے ہوئے ہیں اور ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس خالی جگہ سے اس کی کیا مراد تھی، وہ لکھتا ہے:

"He loves the long talks of the cafe, the idleness of the shows . . . teach him discreetly to tire of his daily work, and in this way . . . after having shown him how tiresome all duties are inculcatein him the desire for another existence."

(Trail of the Serpent by Inquire within page 91 Published by Britons Publishing Co., North Devon 1936)

"یعنی ایک تو اس کے اندر بداخلاقی پیدا کرو اور پھر ایسے حالات پیدا کرو کہ اس کے اندر یہ عادت پیدا ہو جائے کہ وہ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر یا کلب میں بیٹھ کر یا اپنے گھر کے ڈرائنگ رُوم میں بیٹھ کر (جگہ سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا) چائے یا کافی (COFFEE) کی ایک پیالی پر لمبی لمبی گپّیں مارنے کا عادی بن جائے۔ اس طرح جب وہ رات کو دیر سے سوئے گا، تو صبح دیر سے اور تھکا ہُوا اُٹھے گا، جس کے نتیجہ میں اس کے قویٰ سو فیصدی صحیح اور نتیجہ خیز کام نہیں کر سکیں گے۔ اسی طرح اس کو سینما، تھیئٹر اور کئی قسم کے دوسرے تماشے دیکھنے کی عادت ڈالو اور بڑی ہوشیاری سے اُسے یہ بات ذہن نشین کرا دو کہ یہ روز روز کی مزدوری تو بڑی مصیبت ہے۔"

ایک شخص جس نے سارے خاندان کو پالنا ہے اور قوم بنانی ہے، اس کو یہ سکھایا جا رہا ہے کہ دیکھو یہ محنت اور مزدوری تو ایک مصیبت ہے، ایک تباہی ہے جو اقتصادی لحاظ سے امرا نے مچا رکھی ہے۔ اور اس طرح اس کے دماغ میں یہ ڈال دو کہ یہ جو ہم ایک سبز باغ دکھا رہے ہیں (کمیونزم یا اشتراکیت وغیرہ) اس EXISTENCE (زندگی) سے اس کو پیار ہونے لگ جائے کیونکہ یہ نظریۂ زندگی بظاہر اس سے کہے گا کہ کام کرنے کی ضرورت نہیں، بس ہر چیز مل جائے گی۔ ہر ضرورت پُوری ہو جائے گی۔ امرا سے چھین چھان کر تمہاری ضرورتیں پوری کر دیں گے۔ حالانکہ نہ انہوں نے اس نظریہ پر عمل کیا ہے اور نہ عقلاً کر سکتے ہیں۔ لیکن جب کسی کو احمق بنانا ہو تو جس چیز سے کوئی دوسرا احمق بن جائے، احمق بنانے والا وہ چیز اس کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

میں یہ بتا رہا تھا کہ نکمّے پن کی عادت اُن بنیادی مہلک عادتوں میں سے ہے جو انسان کی زندگی کو ہر لحاظ سے تباہ کر دیتی ہیں اور اس عادت کا اقتصادیات پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے اگر کسی فرد یا خاندان یا قوم کو نکمّا بیٹھنے کی عادت ہے تو اس فرد کی، اس خاندان کی، اس قوم کی اقتصادی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ نوجوان نسل کا نکمّاپن بھیانک اور بے آبرو مستقبل کا ضامن ہے۔

انگلستان میں اس وقت مصیبت پڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ مَیں نے اوپر جو حوالہ پڑھا ہے وہ ۱۸۲۲ء کا ہے، جس سے یہ بات عیاں ہے کہ وہاں خفیہ انجمنوں کی تخریبی کارروائیاں بہت پہلے سے شروع ہیں۔ مجھے (قیام انگلستان کے دوران میں) احمدی مزدوروں نے بتایا کہ ہم سے یہ انگریز مزدور بڑے ناراض رہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ تم اتنا کام کیوں کرتے ہو؟ ہماری طرح نکمّاپن کیوں اختیار نہیں کرتے؟ وہاں کے مزدوروں میں نکمّے پن کی عادت کا یہ حال ہے کہ اگر ایک مزدور اپنے نگران سے کہے کہ مجھے پیشاب آیا ہے تو اس کا نگران باوجود یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ بہانہ بنا رہا ہے اُسے روک نہیں سکتا۔ ورنہ انگلستان بھر میں ایک ہنگامہ بپا ہو جائے اور لوگ بھڑوں کی طرح پیچھے پڑ جائیں کہ جی اتنا ظلم! پیشاب کرنے سے روکا گیا ہے۔ لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ ایک مزدور کہتا ہے مَیں نے پیشاب کرنے جانا ہے مگر وہ اخبار ہاتھ میں پکڑتا ہے۔ سگریٹ کی ایک ڈبیا جیب میں ڈالتا ہے اور پیشاب

کرنے چلا جاتا ہے اور ایک گھنٹہ تک اخبار پڑھ کر اور سگریٹ کی ڈبیا ختم کر کے آرام سے باہر نکل آتا ہے۔ کوئی بھی اسے کچھ کہہ نہیں سکتا، ورنہ لیبر یونین یا ٹریڈ یونین والے انتظامیہ کے پیچھے پڑ جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اُن کی حالت اقتصادی اور اخلاقی ہر دو لحاظ سے (یہاں دونوں کا ذکر ہو چکا ہے) اتنی گِر گئی ہے کہ وہاں کے بعض عقلمند لوگ یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اس کی اصلاح نہ کی گئی تو ہم تباہی کے گڑھے میں گر جائیں گے۔ ویسے اس لحاظ سے وہ قابلِ رحم بھی ہیں کہ وہ اِن بیماریوں میں خود مبتلا نہیں ہوئے بلکہ خفیہ انجمنوں نے بڑی کوشش سے، بڑی ہوشیاری سے اُنہیں ان بیماریوں میں مبتلا کیا ہے۔

نکمّے پن کی عادت کی وجہ سے ایک اور بنیادی خرابی جنم لیتی ہے اور وہ سفارش ہے۔ مثلاً ایک طالب علم دورانِ سال محنت نہیں کرتا، امتحان قریب آتا ہے تو اُسے فکر ہوتی ہے مَیں پاس نہیں ہو سکوں گا۔ چنانچہ جب وہ امتحان کے ہال میں جاتا ہے تو بعض دفعہ چاقو سے سفارش کرواتا ہے۔ ایک دفعہ پنجاب یونیورسٹی کے ایک سنٹر میں جو صاحب امتحان لینے گئے، انہوں نے پہلے ہی دن یہ نظارہ دیکھا کہ ہر لڑکے نے ساڑھے پانچ انچ بلیڈ کا سپرنگ والا چاقو کھول کر اپنے ڈسک پر رکھ لیا، اور آرام سے ایک دوسرے سے پُوچھ کر اور کتابیں نکال کر پرچہ حل کرنا شروع کر دیا۔ بیچارے امتحان لینے والے کا بُرا حال ہو گیا، وہ ڈر کے مارے کچھ کہہ ہی نہیں سکتا تھا، اس نے یونیورسٹی کو رپورٹ کی وہ سنٹر بند ہُوا۔ پھر یونیورسٹی نے ہمارے کالج کو لکھا (جس سے ہمیں اصل واقعہ کا علم ہوا) کہ آپ اپنے کالج کے سٹاف میں سے کوئی ایسا ممبر دیں جو وہاں جا کر دلیری سے امتحان لے۔ یہ تو چاقو کی سفارش تھی، پھر پیسے کی سفارش اور اثر و رسُوخ کی سفارش الگ ہے۔

آخر سفارش کی ضرورت کیوں پڑی؟ سفارش کی ضرورت اِس لیے پڑی کہ سفارش کروانے والے مثلاً طالب علم نے اپنی زندگی کے ایک دَور میں (جو ہماری مثال میں اس کا امتحان سے پہلے سال دو سال کا دَور ہے) اپنے اوقات کو صحیح طور پر خرچ کرنے کی بجائے گپّیں ہانکنے، یونہی بیکار ہوائی قلعے تعمیر کرنے، سوئے رہنے اور اسی طرح کی نکمّا پن کی دوسری عادتوں میں اپنا وقت ضائع کر دیا۔ جب امتحان قریب آیا، اس کو فکر پیدا ہوئی، فیل ہو گیا تو بدنامی ہوگی، سال مارا جائیگا اس کو یہ بھی نظر آ رہا ہوتا ہے کہ شاید سفارش پر اس کو نوکری بھی مل جائے۔ اگر پاس نہ ہوا تو کوئی اور آدمی سفارش کروا کر وہ جگہ لے جائے گا۔ چنانچہ وہ سفارش کروا کر پاس ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

دراصل اِس نکمّے پن کی وجہ سے انسان کے قوٰی صحیح اور پورے طور پر نشو و نما حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ اُن کے اوپر وہ زیادہ سے زیادہ بوجھ نہیں پڑا جس کے اُٹھانے کے لیے اس نے تدریجی طور پر خود کو قابل بنا لینا تھا مزید بوجھ اُٹھانے کا۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق جس میں تدریج کارفرما ہوتی ہے اپنے مقام اور وقت کے لحاظ سے اور تربیت کے لحاظ سے اور حاصل کردہ نشو و نما کے لحاظ سے جتنا بوجھ اُٹھا سکتا تھا اٹھاتا تو سفارش کی ضرورت

بھی نہ پڑتی اور قوم کو ایک ذہن کے ضائع ہونے کا نقصان بھی نہ ہوتا۔

سفارشوں سے حصولِ مال کی کوشش بھی نکمّے پن کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قوت عطا کی ہے اور ساتھ ہی ہمیں تسلّی بھی دی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو قوّت توانائی دی کہ وہ صرف پانچ افراد کا پیٹ بھر سکے یا کپڑے وغیرہ کا انتظام کر سکے اور ان کی دوسری اقتصادی ضروریات کا کماحقّہ، خیال رکھ سکے، لیکن عملاً اس کا خاندان دس افراد پر مشتمل ہوتا ہے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو تسلی دیتا ہے کہ مَیں صرف رحیم ہی نہیں، بلکہ رحمان بھی ہوں۔ تم اپنی طرف سے پوری کوشش کرو، اپنی طاقت اور قوّت کو خرچ کرو، تمہیں اس کا بدلہ مل جائے گا۔ اِس طرح خدا کی صفتِ رحیمیت کے ماتحت پانچ افراد کا تو گزارا ہو گیا باقی پانچ کے متعلق اللہ تعالےٰ نے اسے تسلّی دی کہ میری صفت رحمان بھی ہے میں نے ان کا انتظام کیا ہوا ہے۔ مَیں نے اُن کے حصّہ کا مال کسی اور کو دیا ہوا ہے اور اس کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمہارے باقی ماندہ افراد کے حق کو تمہارے تک پہنچائے تاکہ تمہارے حقوق پُورے ہوں۔ لیکن جو شخص نکمّا رہتا ہے اس کی قوتیں اپنے نشو و نما کے کمال تک نہیں پہنچ سکتیں۔ ایک بیمار پھل کی طرح اس کی نشو و نما بھی داغدار ہوگی۔ اس کی شخصیت کی اس کے نفس کی کماحقّہ، نشو و نما نہیں ہو سکے گی اور اس طرح انسان کا مقصدِ حیات پورا نہیں ہو سکے گا، کیونکہ خدا تعالیٰ اپنے بندے میں اپنی صفات کا ظِلّ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہی اس کی پیدائش کی غرض ہے اور عبادتِ الٰہی کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حُسن میں رنگین ہو جائے اور اس کے احسان کے جلوے اس کے نفس سے پھُوٹنے شروع ہو جائیں۔ یہ عبادت کا ایک طبعی نتیجہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اِنسان کو اسی غرض کے لیے پیدا کیا ہے۔ اِس سے نہ صرف خود انسان کو فائدہ ہوتا ہے بلکہ دنیا کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ لیکن ایک شخص جسے مثلاً اللہ تعالیٰ نے ترقی کرنے کی سَو اکائیاں عطا کی ہوں مگر وہ اپنے نکمّے پن کی وجہ سے اُن میں سے پچاس کو ضائع کر دے تو وہ اس سیب کی طرح ہے جس کا آدھا حصّہ گلا سڑا ہُوا ہوتا ہے یا اس کی حالت اس آم کی سی ہے جس کی ایک طرف کیڑا لگ جاتا ہے اور دوسری طرف سے قابلِ استعمال بھی ہوتا ہے یا ایک ایسی سیڑھی کی طرح ہے جو درمیان میں سے ٹوٹ گئی ہو یا اس کی مثال ایسے پرندے کی ہے جس کے اُڑن پروں (پرندوں کے جو پَر ہوتے ہیں اُن کے بعض حصّے پرندے کو اُڑنے میں مَدد دیتے ہیں اور بعض اس کے BALANCE (توازن) کو قائم رکھنے میں مدد دیتے ہیں) میں سے دو چار پَر گِر گئے ہوں اور وہ اتنی پرواز کے قابل نہ رہا ہو جتنی پرواز کی طاقت اللہ تعالیٰ نے اُسے عطا کر رکھی ہے۔ ہم نے بعض دفعہ شکار کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ اگر کسی مرغابی کے پَر کا اگلا حصّہ معمولی سا بھی زخمی ہو جائے تو وہ اپنی ڈار کے ساتھ اُڑ نہیں سکتی۔ غرض جو چیز اپنی ڈار کے ساتھ اڑ نہیں سکتی اس کے متعلق آپ سمجھ سکتے ہیں کہ پھر وہ منافقوں کی ڈار کے ساتھ مل جاتی ہے۔ منافق کے اندر بھی پہلے تھوڑی سی کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ پھر گلے شکوے پیدا ہوتے ہیں جس کی ذمہ داری دراصل خود اس پر عاید ہوتی ہے پھر وہ ایسی تکلیف محسوس کرتا ہے جو درحقیقت کسی اور کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا اور ہمیں قابلیتیں اور طاقتیں عطا کیں اور ہمیں حکم دیا کہ تم اپنی قابلیت کی زیادہ سے زیادہ نشوونما کرو اور ساتھ یہ تسلّی بھی دی کہ میں نے تمہاری طاقتوں اور قابلیتوں کی نشوونما کو کمال تک پہنچانے کے سامان بھی پیدا کر دیئے ہیں، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی دین یا عطا کو ضائع کر دیتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے کسی کے عُضلوں کو بڑا مضبوط بنایا ہے مگر وہ اپنی اس طاقت کو عیّاشی اور مختلف نشوں کی وجہ سے ضائع کر دیتا ہے تو وہ اپنے کمال کو پہنچ نہیں سکتا مختلف قسم کے نشے انسان کی جسمانی اور ذہنی طاقتوں کو مضمحل، اور اس کی اخلاقی اور روحانی طاقتوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ پھر ایسا انسان اُن رفعتوں تک پہنچ نہیں سکتا جن رفعتوں تک پہنچنا اللہ تعالیٰ اُس سے چاہتا تھا، اور جن رفعتوں تک پہنچنے کو اللہ تعالیٰ پیار کی نگاہ سے دیکھتا اور اپنی محبت سے نوازتا۔ مگر جس شخص نے اپنے رب کی معرفت کو حاصل کیا، جس نے اپنے نفس کو پہچانا، جو علیٰ وجہ البصیرۃ اس حقیقت پر قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے نہایت ہی اعلیٰ اور ارفع درجہ کے قرب کے حصول کے لیے پیدا کیا ہے، مگر پھر وہ اپنی غفلت، کوتاہی اور نکمّے پن کی وجہ سے اس مقام کو حاصل نہیں کر سکا، اس سے بڑھ کر اور دوزخ کیا ہوگی جس میں وہ اس احساس کی وجہ سے جلتا رہتا ہے کہ مَیں نے تو اپنے ربّ کی محبّت اور پیار کو حاصل کرنا تھا، مگر میں اپنے گناہوں کی وجہ سے اُسے حاصل نہیں کر سکتا۔

بہرحال دنیا کے مختلف ملکوں، مختلف خِطّوں اور مختلف خاندانوں میں گندی عادتیں اس قدر وسعت سے پیدا ہو چکی ہیں کہ اگر میں ان کو گنوانا شروع کر دوں تو شاید اُن کی ضخیم کتابیں بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اصولی طور پر تمہاری ہر عادت میرے حکم اور فرمان کے ماتحت ہونی چاہیئے، تمہاری ہر عادت کو تمہاری قوتوں اور اِستعدادوں کی نشوونما میں ممدّ ہونا چاہیئے، کیونکہ مَیں نے ان کی کماحقّہٗ نشوونما کے لیے سامان پیدا کر دیئے ہیں۔ جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے مالی قربانی کی عادت ہوتی ہے۔ وقت کی قربانی کی عادت ہوتی ہے۔ بہت سے تہجّد پڑھنے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جنھوں نے ابتداء میں ہفتہ میں ایک بار پندرہ منٹ کے لیے اُٹھنا شروع کیا، پھر ہفتے میں دو بار پندرہ منٹ کے لیے اٹھنا شروع کیا پھر پندرہ منٹ کے لیے سارا ہفتہ اُٹھتے رہے۔ پھر پندرہ منٹ سے ہوتے ہوتے آدھا گھنٹہ، پھر گھنٹہ اور پھر ڈیڑھ گھنٹے تک اُٹھنے کی توفیق ملی اور اس طرح عادت زیادہ سے زیادہ پختہ ہوتی گئی۔

جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا تھا کہ انسان کا اپنے اندر نیک عادت ڈالنے کی قابلیّت کی توفیق پانا اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ مبتدی کو روحانی ارتقا کے دَور میں ایک عظیم مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ بڑی کوشش سے، اپنے نفس پر زور ڈال کر اور قربانی دے کر خدا تعالیٰ کے لیے کام کر رہا ہوتا ہے۔ بعد میں اُس پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ اس کی عادتیں پختہ ہو کر اتنی ترقی کر جاتی ہیں کہ وہ بغیر کسی احساس کے قربانی دیتا ہے۔ حتّٰی کہ اُس کے CONSCIOUS MIND میں بھی نہیں ہوتا کہ مَیں خدا تعالیٰ کے لیے کچھ کر رہا ہوں۔ چنانچہ وہ اس سے بھی آگے نکل جاتا ہے اور پھر اپنی طاقت کے مطابق اور زیادہ بوجھ ڈالتا ہے تاکہ مزید ذمہ داریوں کے

بجا لانے کی عادت پڑے۔ ہم نے دیکھا کہ نئے احمدی شروع شروع میں کسی کے آوازے کسنے پر ہی گھبرا جاتے ہیں، پتہ نہیں کیا ہو جائیگا، اس معمولی سی مخالفت پر کہہ دیتے ہیں یہ تو بڑی مصیبت پڑ گئی۔ لیکن پرانے احمدی ماشاءاللہ ۱۹۵۳ء کی آگ میں سے بھی نکل جاتے ہیں، وہ ۱۹۶۸ء کی آگ میں سے بھی گزر جاتے ہیں۔ ان کو اس مصیبت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ بلکہ زبردست سے زبردست مخالفت کو بھی ہنستے ہوئے برداشت کر لیتے ہیں۔ اُن کی قوتِ برداشت کا تو یہ عالم ہے کہ ۴۷ء کی آگ میں سے بھی ہنستے ہوئے نکل آئے تھے حالانکہ حکومت بھی ظالم اور لوگ بھی خونخوار بنے ہوئے تھے۔ سِکّھوں کو بھی ایک جنون تھا۔ آخری دنوں میں مسجد مبارک کی دیواروں پر قریباً روزانہ ہی گولیاں آکر لگا کرتی تھیں۔ گرمیوں کے دن تھے ہم اوپر بیٹھے قہقہے لگا رہے ہوتے تھے، کوئی پرواہ ہی نہیں ہوتی تھی کیونکہ قربانیاں دینے سے مخالف حالات کا مقابلہ کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ جب اِس قسم کی عادت پیدا ہو جاتی ہے تو خدا تعالیٰ کہتا ہے اور آگے بڑھو۔ میرے اور قریب آجاؤ۔ لیکن بُری عادت اس سے اُلٹ سمت میں چل رہی ہوتی ہے یعنی وہ انسان کو خدا تعالیٰ سے دُور سے دور تر لے جا رہی ہوتی ہے۔ آج آدھ گھنٹہ ضائع کر دیا، ریسٹورنٹ میں بیٹھے گپّیں لگاتے رہے۔ پھر اور شوق پیدا ہوا۔ پہلے ہفتہ میں ایک دن ضائع کرتے تھے، پھر دو دن اور پھر تین دن، حتّٰی کہ سارا ہفتہ ہی ضائع کرنا شروع کر دیا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس کا نتیجہ بڑا ہی خطرناک نکلتا ہے انسان کی قوتوں کی نشوونما نہیں ہو پاتی۔ انسان خدا تعالیٰ کا پیار کھو دیتا ہے۔ دُنیا کی عزّت بھی چلی جاتی ہے کیونکہ دنیا کی عزّت تو اس شخص کو ملتی ہے جس کو خدا تعالیٰ عزّت دینا چاہے اور وہ اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے سے ہی ممکن ہے۔

وقت کا ضیاع ایک قومی نقصان ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر سارے پاکستانی اپنی استعداد کے مطابق اقتصادی میدان میں اپنا پورا زور لگا دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا معیارِ زندگی ایک سال کے اندر اندر دُگنا تِگنا نہ ہو جائے۔ پیداوار کے حصول میں خالی ہاتھ یا پاؤں کا کام نہیں (بعض کام پاؤں سے بھی کیے جاتے ہیں) یا ہتھوڑے کا کام نہیں ہوتا، بلکہ عقل کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنی پوری توجہ (CONCENTRATION) سے ایک کام کر رہا ہے۔ وہ ایک چیز کو آدھ گھنٹے میں تیار کر دیتا ہے، لیکن اس کے ساتھ کام کرنے والا ایک دوسرا مزدور اسی چیز کو ایک گھنٹے میں بھی تیار نہیں کر سکتا۔ پس توجہ بھی تو آخر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ایک عطا ہے، ایک قوت ہے۔ اگر یہ اور دوسری تمام طاقتیں اور قوتیں اس رنگ میں کام کرنے لگ جائیں جس رنگ میں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ کام کریں تو ہماری اقتصادی حالت دُگنی تِگنی اچھی ہو جائے مگر ہم دوسروں کی نقلیں اتارنے کے لیے تو تیار ہو جاتے ہیں، اپنی ذمہ داریاں نباہنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ میں عبادت کا چھٹا تقاضا یہ بتایا ہے کہ تمہاری ہر عادت اللہ تعالیٰ کے لیے اور اُس کے حکم کے تابع اور ہر بُرائی کے خلاف جنگ کرنے والی ہونی چاہیئے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ مَیں

اللہ تعالیٰ کے احکام کی تو میں پابندی کرتا ہوں، لیکن میری عادتیں، میری خواہشات اور میری مرضی کے مطابق ہونگی، تو ایسا شخص پورے طور پر متقی نہیں کہلا سکتا، نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ کا پیار حاصل کر سکتا ہے حالانکہ عادتِ صحیحہ کی صورت میں وہ اپنی استعداد کے مطابق اس سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ کا پیار حاصل کر سکتا تھا۔

حقیقی عبادت کا ساتواں تقاضا مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ میں یہ بیان ہوا ہے کہ جب تمہیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے کسی قسم کا کوئی اثر یا رُسوخ حاصل ہو تو تمہارا یہ غلبہ، یہ طاقت، یہ اثر اور یہ رسوخ اور یہ راعی ہونا خالصتہً اللہ تعالیٰ کے لیے ہو کیونکہ "الدِّیۡن" کے ایک معنے غلبہ و اقتدار کے بھی ہیں جس طرح سامراجی (IMPERIALISTS) حکومتیں دنیا میں تباہی مچاتی رہی ہیں، دیکھنا کہیں تم بھی اس غلبہ و اقتدار کی صورت میں غیر اقوام کو اقتصادی طور پر لوٹنا شروع نہ کر دینا بلکہ ایسی صورت میں تمہارے لیے یہ ضروری ہے کہ تم خدا تعالیٰ کی صفات میں رنگین ہو کر اقتصادی ذمہ داریوں کو نباہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ربّ العالمین ہے۔ تمہیں جہاں جہاں اور جس جس رنگ میں اثر و رسوخ حاصل ہو اس کے استعمال میں ربوبیّتِ عالمین کا تقاضا مدِّ نظر رہنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ تم عالمین کے کسی ایک حصے کی ربوبیت اور دوسرے حصے کی ہلاکت کی تجاویز سوچنے لگ جاؤ، بلکہ اس عالمین کی ہر مخلوق کی ربوبیت کے لیے کام کرنے کی تجاویز سوچنا اور پھر عملاً ان کے مطابق کام بھی کرنا تمہارا فرض ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندرونی حُسن کو اجاگر کرنے کے لیے اپنی صفت رحمان کا ظل بننے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ بیشک نہ کسی سے تمہارا کوئی تعلّق ہے، نہ کسی کا تم پر کوئی احسان ہے، نہ کسی سے کسی قسم کے فائدہ کی تمہیں امید ہے باایں ہمہ اگر تم دیکھتے ہو کہ کسی کے بعض حقوق اسے نہیں مل رہے تو تم اسے وہ حقوق دِلوانے یا خود دینے کی کوشش کرو تمہارا یہ عمل دراصل رحمانیت کا ایک جلوہ ہے، کیونکہ جس کے حقوق ادا کرنے کی تم کوشش کر رہے ہو اس نے کوئی کام نہیں کیا کہ اسے اجرت دینی ہے اس نے کوئی احسان نہیں کیا کہ اس کا بدلہ چکانا ہے۔

یہ مضمون فی ذاتہٖ بڑا وسیع ہے، کیونکہ ہر راعی کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس طرح عادتیں بے شمار ہیں، اسی طرح راعی ہونا بھی اَن گنت جہات سے ممکن ہے۔ عملاً اس دنیا میں کوئی کس کس راعی کو گِن سکتا ہے۔ سکول یا کالج کے لڑکے ہیں۔ اب سکول کے ہیڈ ماسٹر ہوں یا کالج کے پرنسپل، اُن کا صرف یہی دیکھنا کام نہیں ہے کہ طلبہ کی پڑھائی ٹھیک ہو رہی ہے یا نہیں، بلکہ ان کا فرض ہے کہ وہ یہ بھی دیکھیں کہ لڑکوں کی صحّت و تندرستی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے مثلاً غذا ہے، دوا ہے، یا وقت پر آرام پہنچانا ہے، ضرورت کے مطابق کپڑے مہیّا کرنے ہیں کیونکہ یہ بھی صحت پر اثر ڈالتے ہیں۔ انہیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ آیا یہ ساری چیزیں ان کے پاس ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں تو وہ ان کا انتظام کریں، کیونکہ ہمارے ربّ نے فرمایا ہے کہ مَیں ہر انسان کو قوتیں دینے کے بعد ان کے نشو و نما کے کمال تک پہنچنے کے سامان پیدا کر چکا ہوں۔ اگر کسی کو وہ سامان میسّر نہیں آ رہے تو وہ مظلوم ہے۔ اس مظلومیّت سے اور اس ظلم سے چھڑانے کی

کوشش کرنا ازبس ضروری ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم میری عبادت کا حق ادا نہیں کر سکو گے جب تک کہ اقتدار یعنی راعی ہونے کی حیثیت میں تمہارے کام خالصتہً میرے لیے اور میرے احکام کے ماتحت نہیں ہوں گے۔ اگر تمہارے کام میرے لیے ہوں گے تو میری عبادت کا حق ادا ہو جائے گا، تمہیں میرا پیار حاصل ہو جائے گا۔ تمہیں میری رضا کی جنتیں مل جائیں گی پھر یہ دنیا وہ دنیا بن جائے گی جو مَیں بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن اگر تم راعی بننے کے ساتھ اپنی مرضی چلاؤ گے، اگر تم راعی بننے کے بعد نکمے پن کی عادت کی وجہ سے ان ذمہ داریوں کی طرف توجہ نہ دو گے جن کی طرف تمہیں توجہ دینی چاہیئے تو پھر تم میرے غضب کو مول لینے والے بن جاؤ گے۔

اس حصّہ کا بھی ہمارے اقتصادی نظام سے بڑا تعلّق ہے، کیونکہ جیسا کہ (اس وقت تو مَیں اسی پر اکتفا کروں گا طبیعت میں کچھ کمزوری کا احساس بھی ہے) مَیں پہلے بتا چکا ہوں کہ قرآن کریم نے تدبیر یعنی منصوبہ بندی کی طرف شروع سے توجہ دلائی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بڑی ضروری ہے کہ جو آدمی ذمہّ داری کی جگہ پر ہوں (ذمہ داری کی جگہیں تو کروڑوں ہیں، صرف اعلیٰ احکام ہی ذمہ داری کی جگہ پر نہیں ہوتے، ذمہ داری کے لحاظ سے گھر کا مالک بھی ذمہ دار ہے) ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے دائرہ کے اندر حالات سے واقفیت پیدا کریں۔ ہر وقت بیدار اور چوکس رہ کر اپنے ماحول میں بسنے والوں کی ضرورتوں اور حقوق کو معلوم کرنے کے بعد ان کو پورا کرنے کی حتی المقدور کوشش کریں، لیکن اگر وہ ضرورت مند کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور حق دار کے حقوق کو ادا کرنے کا انتظام نہیں کر سکتے، تو پھر ان کا یہ فرض ہے کہ وہ ان ضرورتوں اور حقوق کے متعلق اس مرکزی اتھارٹی سے رجوع کریں جس کا یہ کام ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق اس دنیا میں اسلام کے اقتصادی نظام کو قائم کرے۔ مثلاً ہمارے ملک میں تو ابھی تک گندم کی باتیں ہو رہی ہیں۔ مزدور کے پیٹ بھرنے کا مسئلہ حل طلب ہے۔ لیکن وہ ملک جو ہر لحاظ سے ہم سے آگے ہیں وہ گندم کی سرحدوں سے نکل کر دودھ کی چراگاہوں (PASTURES) میں داخل ہو چکے ہیں۔ کیونکہ ان کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ نہ صرف سکول میں جانے والے بچوں کے لیے بلکہ دوسرے تمام آدمیوں کو بھی دودھ ملنا چاہیئے، ورنہ لوگوں کی صحت برقرار نہیں رہے گی۔ قرآن کریم نے گندم اور دُودھ کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی، بلکہ یہ کہا ہے کہ مَیں نے ہر فرد واحد کی صحت اور تندرستی کا انتظام کیا ہے۔ ہر شخص کو اس کی عمر کے لحاظ سے پورے طور پر صحت مند اور توانا رکھنے کے لیے جس قسم کی غذاؤں کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے سامان پیدا کر دیئے ہیں۔ ویسے عمر عمر کے لحاظ سے غذائیں بدل جاتی ہیں۔ مثلاً ماں کی گود میں جو بچہ ہے وہ صرف ماں کے دودھ پر گزارہ کر سکتا ہے۔ اور یہ غذا اس کی عمر کے لحاظ سے بہترین غذا ہے۔ جب اُسے ذرا ہوش آتا ہے، دانت نکال لیتا ہے ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے تو اگر اس کے آس پاس کوئی کھانا کھا رہا ہو تو اس سے چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر وہ دوسری غذا کھانی شروع کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے تمہاری صحت و تندرستی کو بہتر سے بہتر حالت

میں رکھنے کے لیے ہر قسم کے سامان مہیّا کردیئے ہیں تمہیں وہ سامان ملنے چاہئیں۔

پھر دوسرے "ازم" دوسرے اقتصادی نظاموں کی طرح اسلام صرف BARE NECESSITIES OF LIFE یعنی خالی ضرورتوں ہی کا خیال نہیں رکھتا، بلکہ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں اسلام کا اقتصادی نظام یہ کہتا ہے کہ ہر شخص کو اچھی سے اچھی صحت کے میسّر آنے، اچھی سے اچھی حالت میں ذہن کو برقرار رکھنے، بہترین اخلاق کے حاصل کرنے اور روحانیت میں بلند سے بلند تر ہوتے چلے جانے کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ پیدا کی گئی ہیں اور وہ تمہیں ملنی چاہئیں، تم ان کو تلاش کرو اور وہ لوگ جو کسی وجہ سے اپنے حقوق لے نہیں سکتے تم ان کے حقوق ادا کرو اور دِلواؤ۔

اِسلام نے کم سے کم پر آکر خاموشی اختیار نہیں کی، بلکہ اسلام ہر قوت کو، ہر استعداد کو، ہر قابلیت کو اس کے کمال میں دیکھنا چاہتا ہے اور جب سارے انسان بحیثیت مجموعی اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں کے ساتھ اپنی نشو ونما کے کمال کو پہنچ جاتے ہیں تو اسے کمالِ قربِ الٰہی کا نام دیتا ہے۔ایک دنیادار شخص صرف دنیا کی طاقتوں کو استعمال کرتا ہے، اس کو دنیا مل جاتی ہے۔لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں صرف دنیوی طاقتیں ہی نہیں دیں، بلکہ بےشمار جسمانی اور ذہنی اور اخلاقی اور روحانی قوتیں اور قابلیتیں بھی دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں اور مَیں یہ چاہتا ہوں کہ تم ان قوتوں اور استعدادوں کو ان کے نشو ونما کے کمال تک پہنچا کر میرا کمالِ قرب حاصل کرو۔یہی حقیقی عبادت کی اصل رُوح اور غرض ہے اور اسی لیے انسان پیدا کیا گیا ہے۔

غرض ہم اس مضمون کے اس حصّہ کو اس رنگ میں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ حقیقی عبادت کا یہ ساتواں تقاضا دراصل اسلام کے اقتصادی نظام کو یہ حسن اور خصوصیت بخشتا ہے کہ جب ہر طاقتور اپنی طاقت کو اس رنگ میں خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو جاتا ہے کیونکہ اُسے اپنی طاقت کو اس رنگ میں خرچ کرنا مقصود ہوتا ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی قوتیں اپنی نشو ونما کی انتہا تک پہنچ جائیں۔ لوگوں کے سارے حقوق ان کو مل جائیں اور ان کی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں۔

(روزنامہ "الفضل" ۲۲ اخاء/اکتوبر ۱۳۴۸ ہش/۱۹۶۹ء)

اسلام کے اقتصادی نظام

میں

اسراف کی ممانعت

خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۵ وفا/جولائی ۱۳۴۸ ہش/۱۹۶۹ء

" اسلام کے اقتصادی نظام نے انسانی ضرورت کی بڑی واضح اور معیّن تعریف کر دی ہے کہ انسان کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی قوتوں کی نشو و نما کے لیے جس چیز کی جس قدر ضرورت ہے وہ اس کا حق ہے اور وہ چیز اس سے چھینی نہیں جائے گی، لیکن جو چیز اس کی ضرورت سے زائد ہے اور اس کی قوتوں کی نشو و نما کے لیے اس کی ضرورت نہیں وہ دراصل اس کی نہیں، بلکہ کسی اور کی ہے۔ جس کو قوتیں تو عطا ہوئیں، لیکن ان کی نشو و نما کے لیے سامان میسّر نہیں آئے "

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

تشہد و تعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

اسلامی تعلیم انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنی اور انسان کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کی کامل نشو و نما کرتی ہے۔ مَیں گزشتہ متعدّد خطبات سے اسلام کے اقتصادی نظام کو ایک خاص نقطۂ نگاہ سے بیان کر رہا ہوں۔ مَیں نے بتایا تھا کہ جس طرح ہر دوسرے شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والی اسلامی تعلیم عبادت کے سب تقاضوں کو پورا کرتی اور اس مقصد کے حصول میں ممدّ و معاون ہوتی ہے اور اس پر عمل پیرا ہو کر انسان اپنے مقصدِ حیات یعنی اللہ تعالیٰ سے ایک زندہ محبّت اور قرب کا تعلق حاصل کر لیتا ہے۔ اسی طرح اقتصادیات کا بھی زندگی کے ایک شعبہ سے تعلق ہے۔ اس شعبۂ زندگی کے متعلق بھی انسان کو ایک کامل اور مکمل تعلیم دی گئی ہے اور جو اسلامی ہدایات اقتصادی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں وہ درحقیقت عبادت ہی کا ایک حصّہ ہیں اور عبادت کے سب تقاضوں کو باحسن وجوہ پورا کرتی ہیں۔

مَیں نے بتایا تھا کہ قرآن کریم کی اس آیۂ کریمہ

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ

وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝

(البینۃ ۹۸: ۶)

میں مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ میں ایسے گیارہ تقاضوں کا ذکر ہے جن کا حقیقی عبادت سے تعلق ہے۔ اس حقیقی عبادت کا تعلق ہماری زندگی کے ہر شعبہ سے، انسان کے ہر فعل، بلکہ اس کی ہر حرکت اور سکون سے بھی ہے۔ غرض اسلام کا اقتصادی نظام بھی حقیقی عبادت کے ان تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے جن کا ذکر مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ میں پایا جاتا ہے۔

آج مَیں حقیقی عبادت کے جس تقاضے کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ ان گیارہ تقاضوں میں سے آٹھواں تقاضا ہے۔ لغت میں "الدِّيْن" کے ایک معنیٰ تدبیر کے بھی کیے گئے ہیں پس اس لحاظ سے مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے معنے یہ ہوں گے کہ اے بنی نوعِ انسان! تمہیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو اور اس عبادت کے سب تقاضوں کو پورا کرو۔ منجملہ ان تقاضوں کے ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ تمہاری ساری کی ساری تدابیر اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص کا رنگ رکھنے والی ہوں۔

قرآنِ کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ مُدبّرِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ وہی ساری تدابیر کا سرچشمہ اور منبع ہے۔

اس سارے عالمین یعنی آسمانوں اور زمین پر اسی کی تدبیر محیط ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ ○

(الرعد ۱۳: ۳)

کہ اللہ تعالیٰ ہر امر کے متعلق تدبیر کرتا ہے اور اس کا انتظام کرتا ہے۔ اور وہ یہ انتظام اس لیے کرتا ہے کہ وہ مخلوق جسے اس نے اختیار دیا ہے، عقل و سمجھ اور فکر و تدبّر کی قوت عطا کی ہے اُس کے لیے اللہ تعالیٰ کے اِس تدبیری نظام میں بہت سی نشانیاں اور علامات اور نمونے قائم ہو جائیں تاکہ اگر انسان اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لے تو لَعَلَّکُمْ بِلِقَآءِ رَبِّکُمْ تُوْقِنُوْنَ کی رُو سے اس کا اللہ تعالیٰ سے ایک قرب، ایک محبّت کا تعلق قائم ہو جائے گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔

پس غور و فکر کرنے والا اِنسان اِس یقین پر قائم ہو جاتا ہے کہ یہ سارا کارخانۂ عالم اور یہ سارا الٰہی نظام واقعی اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے بے شمار پہلوؤں پر مشتمل ہے اور اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے قرب کے لیے، اپنے وصال کے لیے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ سورۂ سجدہ ۳۲ میں فرماتا ہے:۔

"یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ" (آیت ۶)

اللہ تعالیٰ آسمان سے زمین تک اپنے حکم کو قائم کرنے کے لیے تدبیر کرتا ہے، منصوبہ بناتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا منصوبہ انسان کے منصوبہ سے بہت ہی مختلف ہوتا ہے۔ انسان کو بہت سے اعداد و شمار اکٹھے کرنے پڑتے ہیں، گھنٹوں سوچنا پڑتا ہے۔ دوسروں سے مشورے لینے پڑتے ہیں اور جو حقیقی مومن ہیں ان کو بڑی دعائیں کرنی پڑتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنی پڑتی ہے تب جا کر انسانی منصوبہ بنتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی نہیں، وہ تو زمان و مکان کی قیود سے بالا ہستی ہے۔ وہ اپنی تدبیر کا ایک سیکنڈ میں (اگرچہ سیکنڈ کا تعلق وقت سے ہے اور یہ محاورہ غلط سہی لیکن اپنے مفہوم کو سمجھانے کے لیے اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں یا کروڑویں حصّہ یا جو بھی کہیں اس کے اندر) اپنی تدبیر کا فیصلہ کر دیتا ہے "کُنْ فَیَکُوْنُ" والا معاملہ ہوتا ہے۔

بہر حال ہمیں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم کو جاری کرنے کے لیے تدبیر کرتا ہے اور اس کی یہ تدبیر آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے۔ اس لیے حقیقی تدبیر کرنے والی ہستی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوسری مخلوق سے جداگانہ قوتیں اور استعدادیں دی ہیں۔ ایک ہرن کی قوت اور قابلیت انسان کی قوت اور قابلیت سے مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جس رنگ میں جسمانی قویٰ بخشے ہیں اس قسم کے قویٰ دوسری مخلوق یعنی جانداروں وغیرہ کو نہیں عطا کیے، حالانکہ جسمانی لحاظ سے انسان اور دوسرے جاندار بظاہر ایک جیسے اور مشترک القویٰ ہیں۔ لیکن جس رنگ میں

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جسمانی قویٰ اور قابلیتیں بخشی ہیں اس رنگ میں جانوروں کو طاقت اور قابلیت عطا نہیں کی۔ کیونکہ ایک انسان کو جو جسمانی قوت، قابلیت اور استعداد دی گئی ہے اس کا اثر اس کے اخلاق پر پڑتا ہے، لیکن ایک ہرن کو جو جسمانی قوت اور طاقت دی گئی ہے اس کا اثر اس کے اخلاق پر نہیں پڑتا کیونکہ اخلاق کا تعلق انسان سے ہے، ہرن سے نہیں۔ انسان کو جو جسمانی قوتیں عطا ہوئی ہیں اُن کی صحیح یا غلط نشو و نما کے نتیجہ میں اس کا ذہن بھی متاثر ہوتا ہے، اس کے اخلاق بھی متاثر ہوتے ہیں اور اس کی روحانیت بھی متاثر ہوتی ہے۔ لیکن ایک ہرن یا کسی دوسری جاندار چیز کے ذہن یا اخلاق یا روحانیت کے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جانوروں کی ذہنی نشو و نما صرف عادت یا تجربے سے تعلق رکھتی ہے۔ عقل و فکر اور تدبّر و بیان کی قوت انہیں حاصل ہی نہیں۔ یہ شرف صرف انسان کے حِصّہ میں آیا ہے۔ پس چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علاوہ جسمانی قوتوں اور قابلیتوں کے اسے ذہنی اور اخلاقی اور روحانی قوتیں اور قابلیتیں بھی عطا کی تھیں اور ساتھ ہی ہر قسم کی قوتوں کی کامل نشو و نما کے سامان بھی پیدا کیے تھے اور اس سے الٰہی منشا یہ تھا کہ انسان جہاں اپنی جسمانی قوتوں کی نشو و نما کو اس کے کمال تک پہنچائے وہاں وہ اپنی ذہنی، اپنی اخلاقی اور اپنی روحانی قابلیتوں کو بھی ان کے نشو و نما کے کمال تک پہنچائے۔ اس کے لیے انسان کو کسی حد تک آزادی اور اختیار دینا ضروری تھا اور چونکہ اختیار دینا تھا اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے لیے ہدایت یا رہنمائی کے سامان مہیّا کیے جائیں تاکہ اس ہدایت کی رہنمائی میں اس کی تمام قوتوں کی کماحقہٗ نشو و نما ہو سکے۔ اور وہ بنیادی ہدایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کی صفات کا رنگ اپنے اوپر چڑھاؤ۔ یہی وہ بنیادی ہدایت ہے جس کا تمام انبیاء پرچار کرتے رہے ہیں۔ ہر ایک اُمت نے اپنے وقت میں اپنی قوتوں کو اعلیٰ مقام تک پہنچانے کے لیے اس ہدایت سے فائدہ اُٹھایا، لیکن اُمتِ محمدیّہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض کے نتیجہ میں اور اس کامل ہدایت کی وجہ سے جو آپؐ پر نازل ہوئی خیر اُمت قرار دی گئی۔ اس تعلیم سے اُمتِ محمدیہ نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا اور اُنہیں اُٹھانا بھی چاہیئے تھا کیونکہ قرآن کریم سے باہر اس قسم کی کوشش کہ انسان اپنے ربّ کی صفات کا کامل طور پر ہم رنگ بن جائے اور اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا لباس جسے ہم لباس تقویٰ بھی کہتے ہیں وہ پہن لے۔ یہ شرف اُمتِ محمدیہ کے باہر ممکن ہی نہیں، کیوں کہ دوسرے مذاہب کے پاس کامل شریعت نہیں ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے چونکہ صرف جسمانی ہی نہیں، بلکہ ذہنی، اخلاقی اور روحانی قوتوں کی نشو و نما کے سامان بھی پیدا کیے ہیں۔ اس لیے جہاں تک انسان کا تعلق تھا اللہ تعالیٰ نے تدبیر کامل کے ایک حِصّہ کو انسان کے لیے چھوڑ دیا۔ لیکن جہاں تک دوسری مخلوق مثلاً جانوروں اور درختوں اور پودوں کا تعلق تھا، پتھروں اور ہیروں اور جواہرات کا تعلق تھا، اللہ تعالیٰ نے ان سب چیزوں پر اپنی تدبیر کا کامل جلوہ ظاہر فرمایا۔ ان کی ساخت و پرداخت میں کسی اور کی مدد یا ان کی اپنی تدبیر کی کوئی ضرورت باقی نہیں رکھی۔ ہر چیز کی جتنی اور جس رنگ کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے

اس کے لیے ضروری سامان پیدا کر دیئے۔ مثلاً ہرن ہی کو دیکھ لیجئے اس کے کھانے کی جو ضرورت تھی اس کے سامان پیدا کر دیئے گئے۔ ان کے لیے یہ ضرورت باقی نہیں رہی کہ ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کوئی اقتصادی منصوبہ بنائے۔ یہی حال دوسری مخلوق کا ہے کیونکہ ان کو وہ عقل نہیں دی گئی جو انسان کو دی گئی ہے، ان کو وہ اخلاقی قوتیں اور استعدادیں نہیں عطا کی گئیں جو انسان کو عطا کی گئی ہیں، ان کو وہ روحانی قوتیں اور قابلیتیں نہیں دی گئیں جو انسان کو عطا ہوئی ہیں۔ پس یہ جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی قوتیں اور استعدادیں صرف انسان کو بخشی گئی ہیں۔ ان قوتوں کی نشوونما کے لیے ضروری تھا کہ انسان کو اختیار دیا جائے اور پھر اس کو کہا جائے کہ یہ راستہ ہدایت کا ہے اور یہ راستہ گمراہی کا ہے۔ ہدایت کے راستہ پر چلو گے تو اللہ تعالیٰ کے قرب کو حاصل کرو گے اپنی قوتوں کو اُن کی نشوونما کے کمال تک پہنچا سکو گے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں یہ قوتیں اسی لیے ودیعت کی ہیں کہ وہ اس کا قرب حاصل کرے، کیونکہ جو شخص اپنی ہر قسم کی قوتوں اور استعدادوں کو صحیح راہوں پر پرورش کر کے ان کی نشوونما کے کمال تک پہنچاتا ہے وہی کمالِ قربِ الٰہی کو حاصل کر سکتا ہے ورنہ اس کے بغیر قربِ الٰہی کا حصول ممکن ہی نہیں۔

پس چونکہ انسان کی ہر قسم کی قوتوں اور استعدادوں کی کمال نشوونما مطلوب تھی اللہ تعالیٰ نے ایک حصّہ میں انسان کو بھی شامل کیا اور کہا کہ اے انسان! مَیں نے تجھے ہر دوسری مخلوق پر فوقیت بخشی ہے۔ دوسری مخلوق کے لیے تدبیر کرنا ضروری نہیں، لیکن تیرے لیے ضروری ہے کیونکہ تیری کامیابی اس کے بغیر ممکن ہی نہیں، لیکن تیری ہر تدبیر مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ کے مطابق خالصتہً اللہ تعالیٰ کے لیے ہونی چاہیئے۔ اگر تیری تدبیر خالصتہً اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں ہو گی تو پھر تُو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ تُو اپنی قوتوں اور قابلیتوں کی صحیح نشوونما نہیں کر سکے گا۔

سُورۂ سجدہ میں مذکورہ آیت ۶ سے پہلے اور بعد کی بھی بہت سی آیات میں دراصل یہی مضمون بیان ہُوا ہے۔ چونکہ خطبہ میں زیادہ لمبا مضمون بیان نہیں ہو سکتا، اِس لیے مَیں نے اُس میں سے بعض ٹکڑے منتخب کر لیے ہیں۔ شاید ان میں سے بھی مجھے کچھ چھوڑنے پڑیں گے۔ غرض سورۂ سجدہ کی اس چھٹی آیت میں بتایا کہ مُدبّرِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہی آسمانوں اور زمین کی تدبیر میں لگا ہوا ہے۔ اس کے بعد آٹھویں آیت میں فرمایا:

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ

کہ اللہ تعالیٰ نے جو مدبّرِ حقیقی یعنی آسمانوں اور زمین کی تدبیر میں لگا ہوا ہے جو کچھ بھی پیدا کیا ہے اعلیٰ طاقتوں کے لیے پیدا کیا ہے۔

ہمیں ہر چیز میں ایک تدریجی ارتقا نظر آتا ہے۔ درخت میں بھی، اور جانوروں میں بھی، تدریج کا اصول جاری ہے حتیٰ کہ اگر ہم اپنی نظر کو زمانہ کی وسعتوں میں پھیلا کر دیکھیں تو ہمیں صاف پتہ لگتا ہے کہ جمادات میں بھی تدریجی ترقی کا اصول کارفرما ہے مثلاً زمین سے ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد کوئلہ اور ہیرے اور جواہرات بھی بنتے ہیں۔ غرض اللہ تعالیٰ نے

یہاں یہ فرمایا ہے کہ مَیں نے جو کچھ بھی پیدا کیا ہے اس میں بڑی طاقتیں رکھی ہیں۔ میری تدبیر ہی کے نتیجہ میں میری مخلوق کی قابلیتیں اُجاگر ہوتی ہیں اور ان کی طاقتوں کی صحیح نشوونما ہوتی ہے۔ میری تدبیر کے نتیجہ میں اور میرے ہی منشاء کے مطابق ہر چیز اپنی شکل اختیار کرتی ہے۔ ایک یہ ہیرا ہے کتنے نامعلوم سالوں اور زمانوں میں سے گزر کر وہ ہیرا بنا۔ اسی طرح صدیاں گزرنے کے بعد کہیں جا کر پتھر کا کوئلہ کوئلہ بنتا ہے، لیکن جو چیز پتھر کا کوئلہ بنتی ہے وہ کوئلہ نہیں بن سکتی تھی، جب تک اللہ تعالیٰ اُس کے اندر یہ طاقت نہ رکھتا اور اس طاقت کے نشوونما کے سامان نہ پیدا کرتا۔

پس یُدَبِّرُ الْاَمْرَ کے بعد ہمیں اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ہر چیز کا مُربّی اور مدبّر اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ جو بھی منصوبہ اس وقت دنیا کی ہر مخلوق پر حاوی اور حاکم ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر کارفرما ہے، جس کے نتیجہ میں ہر چیز کی اعلیٰ طاقتیں اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہیں، لیکن انسان دوسری مخلوق سے مختلف ہے چنانچہ انسان کے متعلق اسی سورۃ کی دسویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ
وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○

ہم نے اِنسان کو مکمّل طاقتیں دی ہیں اور جیسا کہ ہمیں دوسری جگہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو جو طاقتیں عطا ہوئی ہیں ان طاقتوں کا تعلق صرف اِنسانی جسم سے نہیں، بلکہ اس کے ذہن سے بھی ہے، اس کے اخلاق سے بھی ہے اس کی روحانیت سے بھی ہے۔ دوسری مخلوق کو صرف جسمانی طاقت ملی ہے جبکہ انسان کو یہ چاروں قسم کی طاقتیں ملی ہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ایک حد تک انسانی ذہن سے کچھ خفیف سا مِلتا جُلتا ذہن جانوروں کو بھی ملا ہے۔ لیکن وہ انسانی ذہن سے اتنا مختلف ہے اور اس میں اتنا فرق ہے کہ ہم اس کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ مثلاً انسان کے علاوہ کوئی جانور چاند پر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا، لیکن انسان نے سوچا اور اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کو سمجھا اور اس سے فائدہ حاصل کیا اور چاند پر پہنچ کر واپس بھی آ گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نہ صرف جسمانی طاقتیں دی ہیں، بلکہ ذہنی، اخلاقی اور روحانی طاقتوں سے بھی نوازا ہے اور اس طرح انسان کو دوسری مخلوق کے مقابلہ میں ایک ارفع مقام عطا کیا ہے اس لیے فرمایا کہ میں نے ان طاقتوں کے عطا کرنے کے بعد ان کی کامل نشوونما کے لیے صرف وہ سامان پیدا نہیں کیے جو غیر انسان کی طاقتوں کے لیے پیدا کیے گئے تھے، بلکہ ایک نیا سامان بھی پیدا کیا ہے اور وہ نفخِ روح ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ سب طاقتیں دینے کے بعد اس سے فرمایا کہ مَیں یہ طاقتیں تجھے دیتا ہوں اگر تو ان کی صحیح نشوونما کر سکے اور اس نشوونما کو کمال تک پہنچا سکے تو آخری نتیجہ یہ نکلے گا کہ تو میرا ایک پیارا بندہ بن جائے گا، لیکن تُو اپنی قوتوں اور طاقتوں کی صحیح نشوونما نہیں کر سکتا جب تک تجھے میرے الہام اور وحی کی روشنی حاصل نہ ہو، اس لیے مَیں نے تیرے لیے یہ سامان بھی پیدا کر دیا ہے تاکہ یہ نعمت میسّر آ جانے کے بعد تیرے لیے یہ ممکن ہو جائے کہ تو اپنی طاقتوں

کو اس رنگ میں کمال تک پہنچائے کہ تیرا ربّ تجھ سے راضی ہو جائے۔ یہ شرف انسان کو نفخِ روح یعنی الٰہی کلام کے نازل ہونے کے نتیجہ میں عطا ہوتا ہے۔ ہر زمانے کے لحاظ سے انسان بحیثیتِ نوع جس قدر اپنی قوتوں کو کمال تک پہنچا سکتا تھا اور اس ضرورت کو پُورا کرنے کے لیے جس الہام کی ضرورت تھی، جس ہدایت کی ضرورت تھی، وہ اس کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ عطا کی جاتی رہی اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اور آپؐ کے ذریعہ سے وہ کامل ہدایت اور اکمل شریعت اور اعلیٰ تعلیم نازل ہوئی کہ اگر انسان اس پر عمل کرے تو انسانیت کے کمال کو پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین بندہ بن سکتا ہے۔ یہ بلند مرتبہ پہلی اُمتوں کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ پہلی اُمتوں اور اُمتِ محمدیہ کے درمیان (بلحاظ مرتبہ و مقام کے) فرق کو مَیں نے دوسری آیات سے لیا ہے۔ ویسے آیت زیرِ بحث میں عام معنیٰ مراد ہیں یعنی ہر زمانہ کے انسان کو بحیثیت انسان یہ چاروں قسم کی قوتیں اور قابلیتیں عطا ہوتی رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان دیکھ! مَیں نے تجھے جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی قوتوں سے سرفراز کیا ہے اور پھر اُن کی صحیح نشوونما کے لیے خود تیری رہنمائی کی ہے، خود تیری اُنگلی پکڑی اور تجھے سیدھے راستے پر چلایا ہے۔ ہم نے تجھے ایسے کان دیئے ہیں جو دوسری مخلوق کو عطا نہیں ہوئے، ہم نے تجھے ایسی آنکھیں دی ہیں جو دوسری مخلوق کو عطا نہیں ہوئیں، ویسے شاید ہمارے بچے حیران ہوں کہ آنکھ کی عطا کا صرف انسان پر حصر کیوں کیا جا رہا ہے حالانکہ ہرن کو بھی آنکھ دی گئی ہے، عُقاب کو بھی آنکھ دی گئی ہے، مرغابی کو بھی آنکھ دی گئی ہے اور مرغی کو بھی آنکھ دی گئی ہے، تمام پرندوں چرندوں کو آنکھیں دی گئی ہیں حتیٰ کہ رینگنے والے بعض کیڑوں تک کو آنکھیں دی گئی ہیں۔ لیکن یہاں عام طور پر مخلوقات کو جو آنکھیں دی گئی ہیں ان کا یہاں ذکر نہیں ہے یہاں اس آنکھ کا ذکر ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے کہ جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ اگلے جہان میں بھی اندھا ہوگا یعنی وہ نابینائی اور اندھاپن جس کے نتیجہ میں انسان اللہ تعالیٰ کی وحی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے انقلاب کو دیکھنے اور اس سے فائدہ اُٹھانے سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کی قوتوں کو وہ کمال حاصل نہیں ہو سکتا جس کے لیے اُسے پیدا کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں نے تمہیں کان دیئے ہیں جن سے تم میری وحی کو سن سکتے ہو، مَیں نے تمہیں آنکھیں دی ہیں جن سے تم اپنی بصارت اور بصیرت کے نتیجہ میں میری آیات کو دیکھ سکتے ہو۔ میں نے تمہیں ایسا ذہن عطا کیا ہے کہ کان اور آنکھ کے ذریعہ سے جو علم تم حاصل کرتے ہو اس سے وہ صحیح نتیجہ نکال سکتا ہے گویا انسان ان قویٰ کے ذریعہ اپنے کمال کو پہنچ سکتا ہے ہر فرد اپنے کمال کو پہنچ سکتا ہے، ہر قوم اپنے کمال کو پہنچ سکتی ہے۔ بنی نوع انسان اپنے کمال کو پہنچ سکتے ہیں مسلمان قرآن کریم کے پہلے مخاطب ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُنہیں غیروں سے ممتاز کرنے کے لیے فرقان بخشا ہے۔ اسلام مسلمان سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر وہ قرآنی تعلیم پر عمل کرے گا اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت حاصل کرے گا اللہ تعالیٰ کا حقیقی بندہ بن جائے گا اور اس کی عبادت کے تمام تقاضوں کو پورا کرے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی لازوال محبت اُسے ملے گی جو کسی غیر کو مل ہی نہیں سکتی۔

لیکن باوجود اس کے کہ ہم نے تمہیں غیر سے ممتاز کیا ہے پھر بھی قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ تم میں سے بہت تھوڑے ہیں جو میرے شکرگزار بندے بنتے ہیں۔ ویسے تو قرآن کریم کے مخاطب تمام بنی نوع انسان ہیں، لیکن قرآن کریم جب اپنے مخاطب سے بات کر رہا ہو یا اللہ تعالیٰ قرآن کریم کے ذریعہ اپنے بندے سے بات کر رہا ہو تو کبھی وہ ایک گروہ کو اور کبھی وہ دوسرے گروہ کو مخاطب کر لیتا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ہم اس کے ایک معنی یہ بھی کر سکتے ہیں کہ مسلمان کو مخاطب کر کے کہا جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ تمہیں کان دیئے، تمہیں آنکھیں دیں اور تمہیں دل دیا کہ تم اللہ تعالیٰ کی تعلیم کو سُنو، اس کے نشانوں کو دیکھو اور پھر صحیح نتیجہ اخذ کرو۔ اپنی قوتوں اور استعدادوں کی کماحقّہٗ نشوونما کر کے اللہ تعالیٰ کے قرب کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرو۔ تم بڑے ہی خوش بخت انسان ہو جنہیں اسلام جیسا مذہب ملا، اس پر عمل کرنے کی توفیق ملی اور اس پر عمل پیرا ہونے کا جو انعام ہے یعنی محبّتِ الٰہی وہ تمہیں نصیب ہوئی۔ لیکن اے وہ بدبخت انسان جس نے قرآن کریم کی آواز پر لبّیک نہیں کہا، تُو کتنا بدبخت ہے فطرت کی آواز پر تُو نے کان نہیں دھرے۔ اللہ تعالیٰ کی وحی کے نتیجہ میں ایک انقلابِ عظیم بپا ہُوا مگر تو نے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا اور تو نے اپنے گردوپیش کے حالات سے وہ نتیجہ نہ نکالا جو ایک صحیح دل نکال سکتا تھا۔ آخر نتیجہ یہ نکلا کہ تو اللہ تعالیٰ کی ناشکری پر اُتر آیا۔ تُو نے اُس کے قرب کی راہوں کی بجائے اس سے دوری کی راہوں کو اختیار کر لیا اور اس طرح تُو اپنے اُس مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہا جس مقصد کے لیے تجھے پیدا کیا گیا تھا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے سُورۂ سجدہ کی اِس مذکورہ بالا آیت (اور اس سے پچھلی آیتوں کو ملا کر، کیونکہ سارا مضمون ایک ہی چل رہا ہے) میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ انسان کو ہر لحاظ سے کامل اور مکمّل طاقتیں عطا ہوئی ہیں اور پھر ان طاقتوں کی کماحقہٗ نشوونما کے لیے یہ سامان بھی پیدا کیا کہ اس کے لیے اپنی وحی کی روشنی کا حصول ممکن بنا دیا انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہے اور اس کے دل میں اپنے ربّ کی محبّت حاصل کرنے کی خواہش بھی موجزن ہو تو وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے انسانی طاقتوں کی صحیح نشوونما کے لیے اسے کان دیئے۔ گویا کان کا ایک چشمہ جاری کیا اور جیسا کہ دوسری جگہ سے ہمیں پتہ لگتا ہے یہ چشمہ اپنی پوری روانی کے ساتھ، اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی وجودِ مبارک سے نکلا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ محض الہام تمہیں میرے قرب کا وارث نہیں بنا سکتا تھا کیونکہ الہام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ فرمایا ہے کہ یہ تو شہد کی مکّھی کو بھی ہوتا ہے۔ لیکن قربِ الٰہی کا جو مقام انسان کو حاصل ہو سکتا ہے اور عملاً بہت سے انسانوں کو حاصل ہُوا اور بالآخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود میں اپنے عروج کو پہنچا وہ شہد کی مکّھی کو تو حاصل نہیں ہو سکتا۔

پس فرمایا کہ مَیں نے تمہارے لیے الہام کا چشمہ جاری کیا ہے لیکن جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ کہ تیرے اندر وہ مطلوبہ طاقت ہونی چاہیئے کہ جس رنگ میں تجھے اللہ تعالیٰ کا الہام سُننا چاہیئے اُس رنگ میں سُنے اور پھر ساتھ

ہی جس رنگ میں اللہ تعالیٰ کی آیات کو دیکھنا چاہیئے اس رنگ میں دیکھے اور پھر اس سے ایک صحیح نتیجہ نکا لنے میں کامیاب بھی ہو جائے کیونکہ خدا تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بننے کا راز اسی میں مضمر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی وحی پر غور کرنے اور اس کی آیات کو دیکھنے کے بعد انسان مختلف منصوبے بناتا ہے۔ بعض منصوبے اس کے جسم سے تعلق رکھتے ہیں، بعض اس کے ذہن سے تعلق رکھتے ہیں، بعض اس کے اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض اس کی روحانیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم اِس وقت اُس منصوبہ کی بات کر رہے ہیں جو اُس کے جسم سے تعلق رکھتا ہے۔ ویسے یہ سارے منصوبے درحقیقت ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں لیکن ہم اس وقت اس کی ایک کڑی یعنی اقتصادی نظام کے متعلق بات کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ فرمایا ہے:

قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ
وَمَنْ یُّخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَمَنْ یُّدَبِّرُ
الْاَمْرَ ؕ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰہُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ (یونس: ۳۲)

سورۂ سجدہ کے شروع میں بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین کو اپنی تدبیر سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اب یہاں یہ فرمایا ہے کہ اس تدبیر کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آسمان اور زمین سے انسان کے لیے رزق مہیّا ہوتا ہے اور یہ دراصل آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے بہت سے جلووں میں سے ایک جلوہ ہے۔ سورۂ سجدہ کی آیۂ کریمہ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ میں جو ایک وسیع مضمون بیان ہوا تھا، سورۂ یونس کی مندرجہ بالا آیت اُس مضمون کے ایک باب کی طرف متوجہ کرتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہی کی تدبیر آسمانوں اور زمین میں کار فرما ہے اور ہمیں اس کے بہت سے جلوے نظر آتے ہیں ان میں سے ایک جلوہ یَرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ کے الفاظ میں پنہاں ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے نتیجہ میں کائناتِ عالم میں تمام انسانوں کے لیے "رزق" کا سامان پیدا کیا جاتا ہے۔

"رزق" کے معنے صرف کھانے کی اشیا کے نہیں ہوتے بلکہ اس لفظ کو ہم ضروریاتِ زندگی کے تمام سامانوں سے تعبیر کر سکتے ہیں گویا اللہ تعالیٰ کی اس تدبیر کے نتیجہ میں انسانی ضرورتوں کے پُورا ہونے کے لیے تمام سامان پیدا ہوئے۔ آگے اس کی تقسیم میں دونوں پہلوؤں کو مدّنظر رکھا گیا۔ یعنی نہ صرف سامان پیدا کیے بلکہ اس پیداوار اور اس عطا کی تقسیم کے لیے بھی ایک بڑا ہی حکیمانہ طریق بتایا۔ اقتصادیات میں بھی دو مسائل بڑے اہم ہیں۔ ایک ہے پیداوار کا۔ اور دوسرا ہے اس پیداوار کی تقسیم کا۔ ہمارے تمام اقتصادی مسائل انہی دو نقطوں کے گرد گھومتے ہیں یعنی ایک چیز کو کتنی مقدار میں کتنے عرصے میں پیدا کیا جائے اور پھر اس کی پیداوار کو کس رنگ میں شہریوں میں تقسیم کیا جائے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے آسمان اور زمین میں تدبیر کی اور اس کے نتیجہ میں انسان کی ہر ضرورت کو پُورا کر دیا۔ اب کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اے میرے ربّ تُو نے مجھے جسمانی قوتیں اور طاقتیں تو بڑی عطا کی تھیں، لیکن

ان کی صحیح نشوونما اور اس کے کمال تک پہنچانے کے سامان مہیّا نہیں کیے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اے خدا! تو نے مجھے ذہن تو بڑا اچھا دیا تھا لیکن تو نے مجھے ایسے سامان نہیں دیئے کہ مَیں اپنی ذہنی قوتوں کو اُن کی نشوونما کے کمال تک پہنچا سکوں۔ مَیں نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا، مَیں آگے پڑھ نہیں سکا۔ اے خدا! مَیں اس لیے نہیں پڑھ سکا کہ تُو نے وہ سامان نہیں پیدا کیے جن سے مَیں اپنی پڑھائی کو آگے جاری رکھ سکتا۔ اسی طرح کوئی شخص یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اے میرے ربّ! تُو نے مجھے اخلاقی قوتیں تو بہت عطا کی تھیں لیکن یہ اخلاقی قوتیں جن اصولوں سے اور جس ماحول میں پرورش پاتی ہیں اور اپنے کمال کو حاصل کیا کرتی ہیں، تو نے وہ ماحول نہیں پیدا کیا، وہ حالات نہیں پیدا کیے۔ اس لیے میری اخلاقی قوتیں اپنی نشوونما کی جدوجہد ہی میں ہلاک ہو گئیں اور اپنے نقطۂ عروج کو نہیں پا سکیں۔ اسی طرح کوئی شخص یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اے خدا! تو نے مجھے روحانی قوتوں سے تو وافر حصّہ عطا فرمایا تھا لیکن تُو نے روحانی رفعتوں کے حصول کے سامان مہیّا نہیں فرمائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور یہی سچ ہے اور اللہ ہی حق ہے کہ مَیں نے ربُّ العالمین کی حیثیت سے تمام قوتوں کو پیدا کیا اور ساتھ ہی ان کی نشوونما کے لیے جس جس چیز کی ضرورت و احتیاج تھی میں نے وہ بھی پیدا کر دی ہے اگر کسی شخص کی ضرورت پوری نہیں ہوئی تو وہ مظلوم ہے اور اس کے ماحول میں کوئی ظالم ہے جس کی وجہ سے اُسے اپنا حق نہیں مل سکا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر مَیں چاہتا تو جس طرح میں نے ہرن کو قوت اور طاقت دی اور اس کی قوت اور طاقت کی نشوونما کے سامان پیدا کیے اور وہ اس کو مل بھی گئے۔ اس کو کوئی منصوبہ نہیں بنانا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اسی طرح میں تمہارے ساتھ بھی کر سکتا تھا۔ انسانی جسم کے لیے جس قسم کی غذاؤں کی ضرورت تھی وہ اُسے بھی جانوروں کی طرح میسّر آجاتیں۔ اگر آپ کی آنکھیں ہیں یعنی "السَّمْعَ" کے معنوں میں آنکھیں رکھتے ہیں اور آپ کو جنگل میں جانے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ بھیڑ بکریاں اکٹھی ایک گلّے میں چر رہی ہوتی ہیں، بعض دفعہ بکری ایک بُوٹی کو مُنہ لگائے گی مگر جلد ہی ناک مُنہ چڑھاتے ہوئے اُسے چھوڑ کر آگے نکل جائے گی کیونکہ یہ غذا اس کے لیے ٹھیک نہیں ہو گی۔ اس کے دو منٹ بعد بھیڑ آئے گی، وہ اس بُوٹی کو سُونگھے گی اور پھر بڑی خوشی سے اسے کھانا شروع کر دے گی۔ غرض بکری کے لیے جو سامان پیدا کیا ہے اس کی فطرت کے اندر اس کے پہچاننے کی قوت رکھ دی ہے۔ وہ غذا اُسے خود بخود مل جاتی ہے۔ خود اس کی فطرت اس کا ڈاکٹر، اس کا قائد و رہنما ہوتی ہے۔ اسی طرح بھیڑ سے کہا کہ جو تیری ضرورت ہے وہ تجھے معلوم ہو جائے گی۔ شیر کو کہا کہ جو تیری ضرورت ہے اس کا تجھے پتہ لگ جائے گا وغیرہ۔

غرض ہر چیز کو اس کی ضرورت کا خود بخود پتہ لگ جاتا ہے۔ جانور تو پھر بھی کسی حد تک احساس رکھتے ہیں۔ نباتات تک کو اپنی ضرورتوں کا پتہ لگ جاتا ہے۔ مثلاً ہر درخت کی جڑوں کو پنپنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اس کا اُنہیں پتہ لگ جاتا ہے۔ ہمارے ربوہ کی زمین میں شور اور کلّر بہت زیادہ ہے۔ اپنے دیگر افرادِ خاندان کی طرح مجھے بھی درخت لگانے کا بہت شوق ہے۔ درختوں، پودوں اور پھولوں سے پیار کرنا ہماری طبیعتوں میں رچا ہوا ہے۔

شروع میں جب مَیں لاہور سے ربوہ منتقل ہوا تو میں نے لاہور سے کئی سَو قسم کے پودے لاکر ربوہ میں لگائے، لیکن آٹھ دس قسموں کے سوا باقی سب پودے مُرجھا گئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے ہوا کہ یہ نقل مکانی مَیں نے کی تھی، مگر پودوں کو یہ فضا راس نہ آئی، وہ مُرجھا گئے۔ جب مَیں نے پودا لگایا تو اس کی جڑوں نے محسوس کیا کہ یہاں کی مٹی میں ہمارے کھانے کی غذائیت نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ختم ہو گئے۔ لیکن بعض پودے ایسے بھی تھے جنہوں نے بڑے شوق سے اِس مٹی کو پسند کیا اور دِنوں مہینوں میں انہوں نے اتنا قد نکالا اور اتنا پھیلاؤ آ گیا کہ ہم حیران ہو گئے۔ اِن میں ایک یُوکلپٹس بھی تھا۔ یہ شور زمین کو بہت پسند کرتا ہے۔ جس شور اور کلّر والی زمین میں اور کوئی درخت نہ اُگ سکتا ہو، وہاں یہ بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے۔

پس نہ صرف جانوروں، بلکہ نباتات کے اندر اس کا ڈاکٹر بھی پیدا کر دیا، اُس کا باورچی بھی پیدا کر دیا۔ اس کا درزی بھی پیدا کر دیا۔ مثلاً اس کی فطرت میں درزی کا مظاہرہ ہم اِس طرح دیکھتے ہیں کہ ایک درخت ہے اس کے پتّے چکنے مخملی لباس کی خاصیّت رکھتے ہیں۔ بارش ہوتی ہے تو ایک سیکنڈ کے لیے پانی کا قطرہ ان پر نہیں ٹھہرتا۔ فوراً پھسل کر نیچے بہہ جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا درخت ہے جس کے پتّوں میں کھدّر کے کپڑے کی خاصیت ہوتی ہے۔ بارش کا قطرہ پڑتا ہے تو ان کے اندر جذب ہو جاتا ہے۔ پس ہر درخت کے پتّوں کا اپنا کام ہے۔ ہر ایک کو جس چیز کی ضرورت تھی اُس قسم کا ماہر ڈاکٹر طبیب، باورچی، درزی وغیرہ سارے کے سارے شعبے خدا تعالیٰ نے اس کے اندر ہی قائم کر دیئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اِنسان سے فرمایا کہ مَیں نے تیرے ساتھ کسی اور قسم کا معاملہ کرنا ہے۔ مَیں نے درخت کو اس لیے بنایا تھا کہ وہ تیرا خدمتگزار بنے اور تجھے میں نے اس لیے پیدا کیا اور پروان چڑھایا ہے کہ تو میرا خدمت گزار بنے۔ اس لحاظ سے ان دونوں مخلوقوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پس سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ[1] کہہ کر اس کائنات عالم کی ہر چیز اور ہر مخلوق کو انسان کی خدمت پر لگا دیا۔ فرمایا تیری پیدائش کی غرض یہ ہے کہ تو میرا خادم بنے۔ اِس لیے جو صفات میرے خادم میں ہونی چاہئیں وہ تجھے خود اپنے اندر پیدا کرنی پڑیں گی۔ جو صفات تیرے خادم میں ہونی چاہیئے تھیں اور وہ از خود پیدا نہیں کر سکتا تھا اور تُو بھی اُس میں پیدا نہیں کر سکتا تھا اُس کا مَیں نے انتظام کر دیا ہے۔ تیری طاقت سے زیادہ تجھ پر بوجھ نہیں ڈالا، لیکن تجھے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مَیں نے تجھے اپنا خادم، اپنا عبد بننے کے لیے پیدا کیا اور تیری رہنمائی کی اور پھر تجھے جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی قوتیں بھی عطا کیں اور ان قوتوں کی نشوونما کے کمال تک پہنچنے کے سامان بھی مہیّا کیے اور ان کو جاننے پہچاننے اور اُن سے کما حقّہٗ فائدہ اُٹھانے کے جو ذرائع تھے وہ بھی تجھے عطا کیے۔

[1] سورہ ابراھیم: ۳۴۔

پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں آسمان اور زمین سے رزق عطا کیا ہے اور تیری سمع اور بصر کے ہم مالک ہیں یعنی ہم نے انہیں پیدا کیا اور جس قسم کی سمع اور بصر ہونی چاہیئے تھی وہ سمع اور بصر ہم نے پیدا کی۔ سورۂ سجدہ کی آیت میں تھا جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ۔ مگر سورۂ یونس کی آیۂ کریمہ میں سمع اور بصر کی ایک دوسری خصوصیت کا ذکر کرنے کے لیے جَعَلَ کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ فرمایا ہے اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کان اور آنکھ کا مالک ہے۔ سورۂ سجدہ کی آیۂ شریفہ میں عطا کا ذکر تھا کہ ہم نے یہ یہ سامان پیدا کیے ہیں اور یہ یہ نعمتیں عطا کی ہیں تم ان سے کما حقّہٗ فائدہ اٹھاؤ۔ اور یہاں اس آیہ کریمہ میں یہ بیان ہوا ہے کہ سمع اور بصر کا استعمال اُسی طرح ہونا چاہیئے جس طرح ہم نے حکم دیا ہے، کیونکہ ہم مالک ہیں، تم مالک نہیں ہو۔

پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں اپنا خادم بننے کے لیے پیدا کیا ہے اور اپنے فضل سے ساری دنیا کو تمہاری خدمت پر لگا دیا ہے تاکہ تمہارے قوٰی کی صحیح نشوونما ہو سکے۔ تمہیں میرا حقیقی عبد بننے کے لیے جس ہدایت، رہنمائی کی ضرورت تھی وہ بھی مَیں نے نازل کی۔ بنی نوع انسان کی ترقیات کے لیے تازہ بتازہ کلام اُتارا۔ اگرچہ کامل اور مکمّل کلام اور کامل اور مکمل وحی کا نزول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا، لیکن اس کامل وحی کو سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ذیلی وحی ازبس ضروری تھی۔ آسمان سے رحمتِ باراں کا نزول ہوتا ہے، پانی بہہ کر دریاؤں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر اُس کے آگے بند نہ باندھے جائیں، تالاب نہ بنائے جائیں۔ یا دریاؤں سے نہریں کھود کر پانی کو استعمال میں نہ لایا جائے، تو پانی ضائع چلا جاتا ہے۔ اسی طرح آسمان سے وحی کے نزول اور اس کی حفاظت اور اس کے صحیح استعمال کے سامان ذیلی یا ظلّی یا تابع وحی کی صورت میں پیدا کر دیئے۔ اس وحی کو سننے کے لیے کان اور اس کے نتیجہ میں دنیا میں جو ایک تغیرِ عظیم پیدا ہوا اس کے دیکھنے کے لیے آنکھ اور اس روحانی انقلاب سے نتائج اخذ کرنے کے لیے دل بنایا ہے۔ یہاں سورۂ یُونس کی آیۂ مبارکہ میں اسی مضمون کو اس کے نتیجہ کے رنگ میں بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہیں سمع اور ابصار دیں یعنی کان اور آنکھیں عطا کیں اور مالک ہونے کی حیثیت سے تمہاری ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلا دی ہے اور ان ذمہ داریوں سے کما حقّہٗ عہدہ برآ ہونے کے لیے ہدایت و رہنمائی کے سامان بھی مہیّا کر دیئے ہیں۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں کو اِن کے مالک کے احکام کے مطابق استعمال میں لاؤ جس کے نتیجہ میں تمہارا دل صحیح تعلیم کو اخذ کرے اور پھر اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے تمہارے اندر ہمّت و عزم پیدا ہو۔ جب تم ایسا کرو گے تو نتیجۃً يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ مُردہ قوم میں سے ایک زندہ قوم نکل آئے گی۔ اہلِ مکّہ بتوں کو پُوجتے تھے۔ ہر قسم کے گند میں مبتلا تھے۔ اپنے خالق و مالک خدا سے دور، اتنے دور کہ ان کی دوری ہمارے تصوّر میں بھی نہیں آ سکتی۔ مگر اسلام پر عمل پیرا ہونے سے ان کے اندر زندگی کے آثار نمودار ہوئے ان میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیدا ہوئے، ان میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پیدا ہوئے۔ اور ان میں ابُوجہل کا

ٹا عِکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی پیدا ہوئے۔ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ کا ایک عجیب نظارہ رونما ہوا۔ آسمان سے روحانی رزق کے نزول کے نتیجہ میں ان کے اندر ایک عجیب روحانی زندگی پیدا ہوگئی۔ اس کے برعکس جو شخص سمع اور ابصار کے مالک کی ہدایات پر عمل پیرا نہیں ہوتا اس کا باپ خواہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو وہ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ کا مصداق ہوتا ہے۔ وہ کبھی اللہ تعالیٰ کے فضلوں کا وارث نہیں بن سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا حصول الٰہی ہدایتوں پر عمل پیرا ہونے پر منحصر ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہیں ان نظائر اور شواہد سے سمجھ لینا چاہیئے کہ میں اس طرح پر اپنے امر اور اپنے حکم کو اپنی تدبیر کے ذریعہ نافذ کیا کرتا ہوں۔ اگر آدمی سمجھے اور غور کرے تو اس کے لیے اس نتیجے پر پہنچنا کوئی مشکل امر نہیں کہ حقیقی سہارا اللہ تعالیٰ کا سہارا ہے۔ اصل پناہ اللہ تعالیٰ کی پناہ ہے۔ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ؁ پھر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟ تم اللہ تعالیٰ کی پناہ میں نہیں آتے؟ اس کو اپنا سہارا نہیں بناتے، اس کی اُنگلی نہیں پکڑتے کہ تم صحیح راہ پر چل کر اللہ تعالیٰ کے پیارے، اتنے پیارے کہ جتنے بیٹے پیارے ہوتے ہیں بن جاؤ، تم اُس کے ایسے خادم بن جاؤ جن سے اللہ تعالیٰ انتہائی شفقت کرتا ہے، تم اس کے ایسے عبد بن جاؤ جن سے وہ انتہائی محبت کرتا ہے۔

یہ تو تھا روحانی دنیا کا ذکر، اب اقتصادیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہیں زمین و آسمان میں جو بھی نعمتیں نظر آتی ہیں، میں اُن سب کا پیدا کرنے والا اور میں ہی سب کا رازق ہوں۔ میں ہی ان تمام چیزوں کا مالک ہوں اس لیے میری ہدایات کے مطابق اپنے کانوں اور اپنی آنکھوں سے کام لیتے ہوئے دنیا میں ایک ایسا اقتصادی نظام قائم کرو، ایسا ہمہ گیر اقتصادی منصوبہ تیار کرو جو زندہ کرنے والا ہو، مارنے والا نہ ہو۔ اگر تم ایسا اقتصادی نظام قائم کروگے جو زندگی بخش ہو، ہلاک کرنے والا نہ ہو، تو اس کے نتیجہ میں تمہارے ذہن میں، تمہارے اخلاق میں اور تمہاری رُوح میں بھی ایک جِلا پیدا ہو جائے گی جس سے وہ مقصد پُورا ہو جائے گا جس کے لیے تمہیں پیدا کیا گیا ہے۔

اور بھی بہت سی آیات ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا بندہ بن نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ کی بندگی کے سارے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے جب تک کہ انسانی تدبیر اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے ہمرنگ نہ ہو جائے کیونکہ مُدبّرِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔ ہماری ساری تدبیریں بے نتیجہ ہیں اگر ہم اپنی تدابیر کو اللہ تعالیٰ کی صفات کے جلوہ کے رنگ میں رنگین نہیں بنا لیتے۔ اب چونکہ دیر ہوگئی ہے اس لیے میں اس حصّہ کو چھوڑتا ہوں۔

قرآن کریم نے ایسے بہت سارے مکر اور تدابیر کا ذکر کیا ہے جو الٰہی تدابیر کے مقابلے پر کھڑی ہوتی اور ناکام ہوتی ہیں اس کی پھر آگے مثالیں دے کر ہمیں سمجھایا ہے اور ہماری عقل اور ہمارے جذبات کو اپیل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ دیکھو! جس کی تدبیر ہماری تدبیر کے قدم بقدم چلے گی وہ تو کامیاب ہوگا اور جس کی تدبیر ہماری تدبیر کے پہلو بہ پہلو نہیں چلے گی وہ کامیاب نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے میرے مسلمان بندے! اقتصادی دنیا میں تیری ہر تدبیر اللہ تعالیٰ کی زمین و آسمان پر حاوی اقتصادی تدابیر کے مطابق اور ہمرنگ ہونی چاہیئے۔ انسان کی جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے

اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان میں جو تدابیر جاری کر رکھی ہیں یعنی اقتصادی نظام قائم کر رکھا ہے (یہ مسئلہ چونکہ بنیادی اور بڑا اہم ہے اس لیے میں اس کو بار بار دُہرا رہا ہوں) اس کو ربُّ العالمین کے چھوٹے سے فقرہ میں بیان کر دیا ہے۔ کیونکہ ربُّ العالمین کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق کو پیدا کیا، ان کے اندر مختلف طاقتیں اور قوتیں ودیعت کیں، ان طاقتوں اور قوتوں کی کما حقّہ، نشوونما کا خود متکفّل بنا اور اگر کسی شخص کو وہ سامان میسّر نہیں آتے یا اُس کا حق اُسے نہیں ملتا (اب ہم انسان کی دنیا میں آجاتے ہیں) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ظالم ہے جو اس کا حق چھین رہا ہے۔ انسانی ضرورت کی ہر چیز کو حق قرار دیا ہے اور اس ضرورت کے اظہار کو درخواست کرنے یا بھیک منگا بننے کی کیفیت سے دوچار نہیں ہونے دیا بلکہ فرمایا ہے درخواست کرنے کی کیا ضرورت ہے، بھیک مانگنے کی نوبت کیوں آئے، تمہاری ہر ضرورت تو تمہارا اپنا حق ہے جسے تم اپنی طاقت اور استعداد کے مطابق اُس کی نشوونما کے لیے حاصل کر سکتے ہو۔ البتہ ہر اس چیز کو رد کر دیا ہے جو انسانی طاقت اور استعداد کی نشوونما کے لیے ضروری نہ تھی۔ مثلاً ایک کمزور ذہن کا بچہ جو ۲۸۰ نمبر لیکر میٹرک پاس کرتا ہے اگر وہ یہ کہے کہ میرا یہ حق بنتا ہے کہ مجھے کالج میں پڑھوایا جائے تو اس کو ایک مسلمان یہ کہے گا کہ دیکھو تم نے یہ ثابت نہیں کیا کہ آگے کالج میں پڑھنا تمہارا حق بنتا ہے کیونکہ اگر تو نے واقعی محنت کی ہے (عام طور پر بچے اس بات سے انکار کر دیتے ہیں کہ انہوں نے وقت ضائع کیا) اور اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنی ہی قابلیّت دی تھی کہ تُو دسویں جماعت میں مر مر کے پاس ہوتا۔ سو تُو پاس ہو گیا، تُو اپنے کمال کو پہنچ چکا ہے۔ تیرا ذہن آگے ترقی نہیں کر سکتا، اب تیری مزید پڑھائی پر پیسہ خرچ کرنا دراصل پیسہ ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے رب العالمین کی حیثیت سے انسان کے جملہ حقوق کی ادائیگی کے لیے تمام ضروری سامان پیدا کر دیئے، لیکن چونکہ انسان کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی قوتوں کی نشوونما بھی ضروری تھی کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنی پیدائش کے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ کے ماتحت تدبیر کے ایک چھوٹے سے حصّہ کو ایک حد تک انسان کے اختیار میں دیدیا اور اسے فرمایا کہ میرے کہنے کے مطابق چل۔ تجھے میری رحمتوں اور میرے فضلوں کے نتیجہ میں بے انتہا خزانے مل جائیں گے۔ اور پھر تو جو بھی تدبیر کرے گا وہ ربُّ العالمین کی صفت کے ماتحت اس کی ربوبیّت کی ظلّیت میں ہوگی اور اس طرح تو میرے حکم کے مطابق اقتصادی نظام بنائے گا اور اسے جاری کر سکے گا۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے تقسیم میں تفاوت پیدا کر دیا۔ کسی کو کمانے کی زیادہ طاقت دے دی اور کسی کو کم۔ ورنہ تو ہمارا ہرن والا حال ہو جاتا یا شیر والا حال ہو جاتا۔ اور جب انسان نے کما لیا تو فرمایا کہ اس میں سے خود دوسروں کے حقوق ادا کرو۔ میں تمہیں بہت بڑا ثواب دوں گا۔ تیرے پاس جو مال ہے یہ دراصل تیری اخلاقی، تیری ذہنی (غور کریں تو یہ بھی شامل ہے) اور تیری روحانی ترقی کے لیے ہے۔ وہ اس طرح پر کہ تیرے مال میں بکر کا حق بھی شامل ہے اب یہ تیری اخلاقی اور روحانی ذمہ داری ہے کہ تو بکر کا حق اُسے پہنچا دے۔ ادھر بکر کو یہ کہا کہ حق تو تیرا تھا تجھے استعداد بھی دی تھی لیکن تجھے تکبّر

اور غرور سے بچانے کے لیے مَیں نے تیرا حق کسی اور کو دیدیا ہے۔ اب وہ تجھے دے دیگا۔ اُدھر اسلامی حکومت کو یہ کہا کہ اگر کوئی شخص رضاکارانہ طور پر دوسرے کے حقوق ادا نہیں کرتا تو یہ تمہارا کام ہے کہ تم حق دار کو اُس کا حق دِلواؤ، لیکن اس دنیا میں مختلف ISMS (ازمز) جب نعرے لگاتے ہیں تو وہ انسانی حقوق ادا کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے اِسی طرح ان میں سے وہ جو اسلام کے اقتصادی اصول کو اچھا سمجھتے ہیں، وہ بھی ان اصول کو اپنانے سے گریز کرتے ہیں۔ آپ اس بارہ میں غور کریں اور سوچیں۔ جہاں تک مَیں نے غور کیا ہے اور سوچا ہے مجھے تو اس کی ایک وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اگر وہ یہ کہیں کہ اسلام نے ایک حسین اقتصادی نظام قائم کیا ہے ہم اس پر چل کر دنیا کو اُس کے اقتصادی حقوق دلوائیں گے، تو اس کے ساتھ ہی انہیں اسلام کی عاید کردہ پابندیوں کو بھی ماننا پڑتا ہے۔ لیکن ایک شخص جو شراب پینے کا عادی ہے وہ یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ مَیں اسلام کے اقتصادی نظام کو جاری کروں گا جب کہ وہ خداتعالیٰ کی عطا کے ایک حصّہ کو خود ہی غلط طور پر استعمال کرنے والا ہے۔ اس واسطے ایسے لوگ زبانی طور پر تو اسلام کے اقتصادی نظام کی خوبیوں کو مانتے ہیں لیکن درحقیقت اس پر عمل پیرا ہونے کی طرف آتے ہی نہیں، صرف کہہ دیتے ہیں کہ ہاں یہ بڑی اچھی تعلیم ہے ایک ہی بات ہے کوئی نام لے دو۔ یہ اصولی طور پر ایک بات نہیں کیونکہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ مَیں نے اسلام کے اقتصادی اصول کو اپنانا اور جاری کرنا ہے اور ان کے ذریعہ ہر ایک آدمی کے حق کو دینا اور دلانا ہے تو ساتھ ہی اسے اسلام کی عائد کردہ پابندیوں کو قبول کرنے کا بھی اقرار کرنا پڑیگا۔ اِس کے بغیر حقوق کی کما حقہٗ ادائیگی ممکن ہی نہیں۔ مثلاً اسلام نے یہ پابندی لگائی ہے کہ اسراف نہ کرو۔ اب جو شخص خداتعالیٰ کے کہنے کے مطابق ایک لاکھ روپیہ کسی اور کا زائد اپنے پاس رکھتا ہے اگر وہ اسراف کرتا ہے تو گویا اس نے ایک لاکھ روپیہ کسی غیر کا اسراف کی نذر کر دیا۔ اب وہ یہ حق اصل حق دار کو کیسے پہنچائے گا۔ غرض اسلام یہ کہتا ہے کہ اسراف سے کام نہ لو ورنہ تم وہ حق ادا نہیں کر سکو گے جو میں نے قائم کیا ہے۔ اسی طرح اسلام نے یہ بھی کہا ہے کہ بخل نہ کرو کیونکہ اس صورت میں اگر تمہارے پاس روپیہ ہوگا بھی تو تم دوسرے کو دینے سے گھبراؤ گے تمہاری طبیعت دوسرے کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ پس اسلام نے اسراف سے بھی بچایا اور بخل سے بھی۔ افراط سے بھی بچایا اور تفریط سے بھی۔

اسلام کے اِقتصادی نظام کی رو سے اِنسان کی تمام طاقتوں کی بہترین نشوونما کے لیے جو سامان پیدا کیے گئے ہیں ان سے کما حقہٗ فائدہ اٹھانے کے لیے جو مال و دولت کسی کو حاصل ہوتی ہے اس کے رکھنے کی اُسے صرف اس حد تک اجازت ہے جو اس کا حق ہے۔ پس یہ حق و حکمت پر مشتمل اقتصادی نظام اس بات کی بھی ضمانت دیتا ہے کہ اے انسان! میرے دائرۂ انتظام کے اندر تجھے امیر کہہ کر کوئی تیرا مال نہیں چھینے گا۔ تجھے امیر کہہ کر کوئی تیری جان لینے کے درپے نہیں ہوگا۔ تیرے بچّوں کو ظلم و تشدّد کا نشانہ نہیں بننے دیا جائے گا۔ اسلام کے اقتصادی نظام کی رُو سے کسی کی اپنی یا اس کے بچوں یا دوسرے DEPENDENTS (متوسّلین) کی جتنی اور جس قدر قوتیں و استعدادیں

ہیں ان کی صحیح اور کامل نشوونما کے لیے جس چیز کی بھی ضرورت ہے وہ ان کا اپنا حق ہے، دنیا کی کوئی طاقت ان سے اس حق کو چھین نہیں سکتی، لیکن جو چیز ان کی ضرورت سے زائد ہے وہ دراصل ان کی نہیں بلکہ کسی دوسرے کی ہے اس لیے جو چیز زائد ہے اُسے شراب میں، اُسے جُوئے میں، اُسے سٹّے میں، اسے گھوڑ دوڑ میں، اُسے جوئے کی مشینوں میں مت لگاؤ (شیطان نے اب جوئے کی ہزار شکلیں بنا دی ہیں۔ بعض ملکوں میں ہر گلی کے کونے پر جوئے کی مشینیں لگ گئی ہیں جس کی وجہ سے جُوا کھیلنے کے لیے دوسرے ساتھی کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کی جگہ لوہے سے کام لے لیا گیا ہے اور لوگ جُوا کھیلنے کی URGE (خواہش) کو وہیں جا کر پورا کر لیتے ہیں)

اسلام کا اِقتصادی نظام کہتا ہے کہ مَیں نے یہ چیزیں تیرے لیے پیدا نہیں کیں۔ تیرے قویٰ کی نشوونما میں ان چیزوں کا کوئی حصّہ نہیں۔ اس واسطے تُو ان چیزوں پر خرچ نہیں کر سکتا، پس امیر کے جائز حق کو تو قائم کیا، لیکن دوسروں کی حق تلفی کی اسے اجازت نہیں دی۔

پس اِسلام کے اقتصادی نظام نے انسانی ضرورت کی بڑی واضح اور معیّن تعریف کر دی ہے کہ انسان کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی قوتوں کی نشوونما کے لیے جس چیز کی جس قدر ضرورت ہے وہ اس کا حق ہے اور وہ چیز اس سے چھینی نہیں جائے گی۔ لیکن جو چیز اس کی ضرورت سے زائد ہے اور اس کی قوتوں کی نشوونما کے لیے اس کی ضرورت نہیں وہ دراصل اس کی نہیں، بلکہ کسی اور کی ہے جس کو قوتیں تو عطا ہوئیں، لیکن اُن کی نشوونما کے لیے سامان میسّر نہیں آئے۔ ظاہر ہے اگر واقعی ہم خالقِ کُلّ اور ربُّ العالمین پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمیں اُس کی صفات کا عرفان حاصل ہے تو پھر اس نظام کے سمجھنے میں کوئی ابہام اور اُلجھن باقی نہیں رہتی۔ کیسا حکیمانہ نظام ہے کہ ایک شخص کو کہا کہ جتنی قوتیں تجھے بخشی ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے سامان تمہیں عطا کر دیئے ہیں۔ دوسرے سے کہا کہ جتنی قوتیں تجھے عطا کی ہیں ان سے کما حقہٗ فائدہ اُٹھانے کے لیے تجھے پورے سامان میسّر نہیں آئے۔ یہ تفاوت اس لیے پیدا کیا ہے کہ اس طرح تمہاری اخلاقی اور روحانی قوتوں کی نشوونما کے سامان پیدا ہوں۔ ایک قربانی دینے والا ہو اپنے ربّ کی خوشنودی کے حصول کے لیے، اور دوسرا تکبر اور غرور سے بچنے والا ہو اپنے ربّ کے قہر اور غضب کے خوف سے۔ اللہ تعالیٰ نے یوں مختلف شکلوں میں سہارا دیکر انسان کی اخلاقی اور روحانی قوتوں کو بلند کیا ہے۔

پس یہ تفاوت پیدا کر کے ہمیں صاف طور پر بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ جہاں رزّاق ہے وہاں وہ مالک بھی ہے جس کو جس قدر چاہتا ہے عطا کرتا ہے اس واسطے اس کی ہدایات کے مطابق رزق کا استعمال ہونا چاہیئے۔ دوسری جگہ فرمایا کہ زمین و آسمان میں اسی کی تدبیر کارفرما ہے اور انسانی قوتوں کی نشوونما کے لیے اس کی دوسری تدبیروں کے علاوہ ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی رحمت سے اِنسان کو اپنی وحی کے انعام سے سرفراز کیا۔ اس کے مطابق ہی انسان آگے ترقی کر سکتا ہے۔ یہاں مالک کہہ کر اس طرف توجہ دلائی ہے کہ انسان کی سمع اور بصر اور اس کے دل حتیٰ کہ اس کی ہر چیز کا

ہیں ہی مالک ہوں۔ اس لیے ہر چیز کو میرے کہنے کے مطابق خرچ کیا جائے، جس کا بالآخر یہ خوشکن نتیجہ نکلے گا کہ وہ دنیا جو اقتصادی لحاظ سے غلام بنائی گئی، جو اقتصادی لحاظ سے ہلاکت کے گڑھے میں پھینکی گئی اور جو اقتصادی لحاظ سے موت کے مُنہ میں پڑی ہوئی ہے اسے ہمارے اس اقتصادی نظام کے قیام کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے خوشحال اقتصادی زندگی نصیب ہوگی۔ چنانچہ میرے پاس جو بھی دوست آتے ہیں ہیں تو اُن سے کہا کرتا ہوں کدھر بھاگے پھرتے ہو تم MINIMUM NECESSITIES OF LIFE (کم سے کم ضروریاتِ زندگی) کی باتیں کرتے ہو، یعنی یہ کہ ہر ایک کو کم سے کم ضروریاتِ زندگی بہرحال میسّر آنی چاہئیں۔ لیکن تم اُس نظامِ زندگی کی طرف پیٹھ کرکے کھڑے ہو جو کہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ انسانی ضروریات جو ہیں وہ بہرحال پوری ہونی چاہئیں۔ اسلام کے اقتصادی نظام میں کم سے کم کا کوئی تصوّر پایا ہی نہیں جاتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ دینے اور دلانے کی ہدایت موجود ہے یعنی جو چیز انسانی قوتوں کی نشوونما کو کمال تک پہنچانے میں ممدّ و معاون ہے وہ اُسے بہرحال زیادہ سے زیادہ میسّر آنی چاہیئے۔ صرف BASIC NECESSITIES OF LIFE (زندگی کی بنیادی ضروریات) مہیّا کرنا یا نیم مردہ اور نیم زندہ رکھنا یا محض زندہ رکھنا اور مرنے سے بچا لینا یہ تو کوئی بات نہیں حالانکہ یہی جسمانی طاقت تو ایک مومن کے روحانی ارتقاء میں مُمدّ و معاون بنتی ہے جیسا کہ مقولہ مشہور ہے کہ روح تو بلند پروازی کی بڑی خواہش رکھتی ہے لیکن جسم ساتھ نہیں دے رہا۔ جسم اس بلند پروازی کا متحمل نہیں۔ یہ بات ٹھیک بھی ہے۔ مثلاً ایک آدمی بیمار ہے۔ وہ کھانسی کی تکلیف کی وجہ سے رات گئے تک کھانستا رہتا ہے۔ رات کے دو بجے تہجد پڑھنے کے لیے اٹھنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو معاف تو کر دے گا، لیکن معافی اور چیز ہے اور تہجد کا انعام نہ ملنا اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔

خطبہ کافی لمبا ہو گیا ہے اور واپس بھی جانا ہے اس لیے باوجود اس کے کہ مجھے دوستوں سے ملنے کی زبردست خواہش تھی ہیں اس وقت ملاقات سے معذور ہوں۔ آپ کو بعد میں کسی جمعہ کے دن یا کسی اور موقع پر ملاقات کا وقت انشاءاللہ ضرور دونگا۔ کیونکہ آپس میں ملنا، باتیں کرنا اور مشورے لینا جماعتی زندگی کے لیے بڑی ہی ضروری بات ہے۔ البتہ یہ ضروری نہیں کہ ایک خاص بات کو سامنے رکھ کر مشورہ ہو۔ ہزار قسم کی باتیں ہیں جن کا آپس میں ملنے ہی سے پتہ لگتا ہے۔ دوست جب مجھ سے ملنے آتے ہیں ایک دوسرے کی سُننے اور سنانے سے مجھے بہت سی نئی نئی باتوں کا علم ہوتا رہتا ہے۔ حالات و واقعات کے مختلف پہلو سامنے آتے رہتے ہیں۔ دوستوں کی انفرادی اور خاندانی مشکلات سامنے آتی ہیں تو دعا کے لیے تحریک ہوتی ہے۔ یہاں مسجد میں زیادہ لمبی باتیں ویسے بھی نہیں ہو سکتیں اس لیے امید رکھتا ہوں کہ آپ مجھے معاف کریں گے اور اجازت دیں گے کہ نماز پڑھانے کے بعد واپس چلا جاؤں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو انشاءاللہ پھر ملیں گے۔

("الفضل" ۲۹ اخاء ۱۳۴۸ ہش / اکتوبر ۱۹۶۹ء)

اقتصادی نظام کی منصوبہ بندی

کی بنیاد

حق و حکمت

پر

مبنی ہونی چاہیئے

خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۶ تبوک ۱۳۴۸ ہش (ستمبر ۱۹۶۹ء)

"پہلا مطالبہ جو ہمارے ربّ نے ہم سے کیا ہے، یہ ہے کہ جب تم اعداد و شمار اکٹھے کرو تو وہ اعداد و شمار صحیح ہوں اور پھر جب اُن اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر تم کوئی منصوبہ بناؤ تو اس بات کا خیال رکھو کہ وہ منصوبہ صرف پنجاب کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہ ہو، وہ منصوبہ صرف مشرقی پاکستان کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہ ہو، وہ منصوبہ صرف سندھ کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہ ہو، وہ منصوبہ صرف صوبہ سرحد کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہ ہو۔ بلکہ وہ ایک ایسا منصوبہ ہو جس سے ہر پاکستانی شہری کو فائدہ پہنچتا ہو"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تشہد و تعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

اسلام کی اقتصادی تعلیم کے اصول اور فلسفہ کے متعلق جو خطبات میں دے رہا ہوں اُنہیں کے تسلسل میں میرا آج کا خطبہ ہے۔ مَیں نے بتایا تھا کہ قرآن کریم نے جب مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کا حکم فرمایا تو دین کے جو گیارہ لغوی معانی یہاں چسپاں ہوتے ہیں اُن سب تقاضوں کو پورا کرنے کا حکم دیا۔ اسلام نے عبادت محض ذکر کو یا محض دعا کو یا محض عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے کو قرار نہیں دیا بلکہ اسلامی تعلیم انسان کے ہر عمل کے متعلق ایسی ہدایت دیتی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا ایک مخلص بندہ اپنے عمل کو اس کی ہدایت کے مطابق کرے تو اس کا ہر عمل خواہ وہ دنیا دار کی نگاہ میں ایک دنیوی عمل ہی کیوں نہ ہو، عبادت بن جاتا ہے۔ اسلام نے انسان کی اجتماعی زندگی اور اقتصادی تقاضوں کے متعلق بھی ایک حسین تعلیم ہمیں عطا کی ہے۔ اگر ہم اپنے اقتصادی تعلقات اور اقتصادی زندگی میں اسلام کی بتائی ہوئی تعلیم کو مدّنظر رکھیں اور اس پر عمل کریں تو ہماری ہر اقتصادی کوشش بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت بن جاتی ہے۔

دین کے آٹھ معانی کے متعلق مَیں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس کے نویں، دسویں اور گیارہویں معنی کے متعلق مَیں نے بیان کرنا ہے۔ سو دین کے نویں معنے حساب کرنا، محاسبہ کرنا ہیں۔ دسویں معنے ہیں فیصلہ، اور گیارہویں معنے ہیں جزا اور بدلہ۔ مَیں نے اس سلسلہ کے پچھلے خطبہ میں دین کے آٹھویں معنے اور آٹھویں تقاضا کے متعلق کچھ بیان کیا تھا۔ میرا وہ بیان تدبیر کے متعلق تھا، کیونکہ مَیں نے جس ترتیب سے یہ معانی لکھے ہیں اس کے لحاظ سے دین کے آٹھویں معنے تدبیر کے ہیں اور اسی پر میں نے خطبہ دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس طرف متوجہ کیا ہے کہ مَیں ایک عظیم اقتصادی نظام دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہوں اس لیے اقتصادیات کو اپنی ڈگر پر نہیں چھوڑا جا سکتا، بلکہ اس کے لیے تدبیر کرنی پڑے گی، منصوبہ بنانا پڑے گا۔ سالانہ، چار سالہ، پانچ سالہ یا دس سالہ جیسا کہ ضرورت ہو۔ پلین (PLAN) بنانے پڑیں گے، سکیمیں بنانی ہوں گی، منصوبے تیار کرنے پڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم اپنے سارے منصوبوں کو خالصتہً میرے لیے بنانا اور اپنے سارے منصوبوں کو اس طرح تیار کرنا کہ اس کے نتیجہ میں تم میری صفات کے مظہر بنو۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں تین اور باتوں کی طرف متوجہ کیا ہے جن کا تعلق تدبیر کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جب تم منصوبہ بناؤ گے اور تم اپنے اس منصوبہ کی تیاری میں میری صفات کے مظہر بنو گے تو تمہارے سامنے

یہ بات آئے گی کہ اس کے لیے تمہارے پاس سارے اعداد و شمار ہونے چاہئیں۔ ساری ضرورتیں تمہارے سامنے ہوں۔ کسی ایک خطہ کی ضرورت نہیں، بلکہ تمہیں رعایا کے تمام شہروں اور تمام خطوں کی ضرورتوں کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ کیونکہ مکمل اعداد و شمار تیار کرنے کے بعد ہی وہ منصوبہ بنایا جا سکتا ہے جو اس تدبیر کے مطابق ہو جو اللہ تعالیٰ دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے۔ مدبّرِ حقیقی تو اسی کی ہستی ہے، اسی کی تدبیر اور اُسی کا حکم اور اُسی کا امر آسمانوں اور زمین پر چلتا ہے۔ لیکن چونکہ اس نے انسان کو اعلیٰ روحانی ترقیات کے لیے پیدا کیا تھا اس لیے اُس نے انسان کو یہ اختیار دیا کہ چاہے وہ ہدایت کی راہ کو اختیار کرے اور چاہے وہ شیطانی راستوں پر چلنے لگے۔ اس اختیار دینے کے نتیجہ میں اور اس وجہ سے کہ اس نے بڑی اخلاقی اور روحانی اور جسمانی ترقیات کرنی تھیں، جہاں تک انسان کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی تدبیر کے ایک حصّہ کو انسان کے سپرد کیا اور اسی وجہ سے تفاوت پیدا کیا۔ کسی کو ایک قسم کی قوتیں اور استعدادیں عطا کیں اور دوسرے کو ایک اور قسم کی قوتیں اور استعدادیں عطا کیں تا تمام بنی نوع انسان ایک دوسرے کی خدمت میں لگے رہیں اور جو حقوق اللہ تعالیٰ نے قائم کیے ہیں ان حقوق کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق قائم کرنے والے ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ساری تدبیر خود ہی کر دیتا جیسا کہ اس نے درختوں کے متعلق ساری تدبیر خود کر دی یا جیسا کہ ہیرے کے بننے میں جو مختلف قوتیں چاہیئے تھیں اور جتنا زمانہ چاہیئے تھا، اور جتنے دَوروں میں سے گزر کر مٹی کے ذرّوں نے ہیرا بننا تھا یہ سارا انتظام اللہ تعالیٰ نے خود کر دیا۔ ہیروں کو اپنی ارتقا کے لیے اور اپنی خصوصیات کو کمال تک پہنچانے کے لیے کسی منصوبہ کے بنانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ان کے لیے روحانی ترقیات مقدر نہیں تھیں۔ یہی حال درختوں اور جانوروں کا ہے۔ انسان کے علاوہ ہر مخلوق کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک کامل اور مکمل تدبیر، ایک کامل اور مکمل منصوبہ کہ جس کے کسی حصّہ پر بھی ان کا اپنا اختیار نہیں بنا دیا اور اس کے مطابق یہ دنیا چل رہی ہے۔ لیکن انسان کے ساتھ اس نے ایسا سلوک اس لیے نہیں کیا کہ اس کے لیے روحانی ترقیات مقدّر تھیں، اس نے ان روحانی ترقیات کے حصول کے لیے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کو پا لینے کی خاطر بہت سے کام اپنے اختیار سے کرنے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اشیا تو سب بنا دیں لیکن اُن سے کام لینے کی قوتیں اور استعدادیں جو تھیں ان میں تفاوت پیدا کر دیا اور مختلف قوتوں اور استعدادوں کے نتیجہ میں جو پیداوار ہوتی اُس کی تقسیم کے لیے خود ہدایت دی اور انسان کو کہا کہ تم میرے حکم سے صاحب اختیار تو ہو، لیکن میرا یہ بھی حکم ہے کہ اگر تم نے اپنے اس اختیار کو میری ہدایت کے مطابق استعمال نہ کیا تو تم میرے غضب کے نیچے ہو گے اور اگر تم اس اختیار کو جو میں نے تمہیں دیا ہے میری ہدایت کے مطابق استعمال کرو گے تو تم میری رحمت کے سایہ تلے ہو گے اور میری خوشنودی کو تم حاصل کرو گے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے تدبیر کا ایک حصّہ انسان کی روحانی ترقیات کی خاطر اس کے سپرد کیا اور اس کو کہا کہ یہ اشیا تو میں نے بنا دی ہیں اور میں نے تمہیں بہت سی قوتیں بھی عطا کی ہیں۔ اب تم اپنے اختیار سے بہت سی ترمیمیں ان اشیا میں کر سکتے ہو مثلاً میری مخلوق کے اجزا کو تجزیہ کے ذریعہ تم پھاڑ سکتے ہو اور علیحدہ کر سکتے ہو۔ اور پھر ترکیب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق انہیں ایک نئی شکل میں جوڑ سکتے ہو۔ چنانچہ نائیلون وغیرہ کے جتنے کپڑے ہیں یا بہت سے رنگ اور

بہت سی جرم کش ادویہ وغیرہ ہیں وہ اسی قانون کے مطابق انسان کو ملیں۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے اور انسان نے اللہ تعالیٰ کی ہر اس صفت کا مظہر بننا تھا جو ہماری زندگی سے تعلق رکھتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ظلی طور پر اس کے خالق بننے کے سامان پیدا کر دئے۔ اگر وہ یہ سامان پیدا نہ کرتا تو انسان اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت کا مظہر نہ بنتا۔ اگر اللہ تعالیٰ جو مدبّرِ حقیقی ہے اس کو منصوبہ بنانے کی قوت نہ عطا کرتا تو اس میں اِس صفت کا مظہر بننے کی طاقت نہ ہوتی۔ پھر وہ مقصد حاصل نہ ہو سکتا جس مقصد کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا تھا کہ وہ اپنی استعداد کے مطابق اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بنے مظہرِ اتم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے، لیکن ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق ذاتِ باری کا مظہر بن سکتا ہے اور مظہر بننے کے جو سامان تھے وہ اللہ تعالیٰ نے عطا کیے ہیں۔

غرض مدبّرِ حقیقی تو خدا تعالیٰ ہی ہے لیکن تدبیر کا ایک حصّہ اُس نے انسان کے سپرد کیا اور کہا کہ اگر تم میرے مدبر ہونے کی صفت کا مظہر بنو تو تم میرے قرب کو پا لو گے کیونکہ ہر قسم کا قربِ الٰہی حقیقۃً مظہر صفات باری ہونے کی جھلک ہے مثلاً اللہ تعالیٰ پاک ہے اس لیے جب انسان پاک ہوتا ہے تو اللہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے اس لیے جب انسان اپنی خداداد طاقتوں کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کے قانون کو استعمال کرتے ہوئے ایک شاکر بندہ کی حیثیت میں خلق کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی صفت "خالق" کا مظہر بن جاتا ہے۔ وہ بعض اجزا کا تجزیہ کرتا ہے اور پھر ترکیب کے ذریعہ یعنی اُن کو ملا کر نئی شکلیں بنا دیتا ہے اور اس میں نیت یہ ہوتی ہے کہ وہ صفاتِ باری کا مظہر بنے اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت جس رنگ میں ہے اُسی طرح اس کی اس صفت کا مظہر بننے کے نتیجہ میں اس کی ربوبیت کے جلوے بھی دنیا دیکھے یعنی بنی نوعِ انسان اس کے نفس میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے جلوے دیکھنے والے ہوں اور اس طرح ان میں اپنے رب کی طرف رجوع کرنے کی رغبت پیدا ہو اور ان کے لیے خدا تعالیٰ کی صفات کا مظہر بننا آسان ہو جائے، کیونکہ جب وہ دیکھیں گے کہ اُن جیسا ایک انسان خدا تعالیٰ کی صفات کا مظہر بن گیا ہے تو پھر ہم صفات باری کے مظہر کیوں نہیں بن سکتے۔ غرض تدبیر کے اس حصّہ کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے سپرد کیا۔ اور اس کے متعلق جو اقتصادیات سے تعلق رکھنے والا مضمون تھا وہ میں پچھلے خطبہ میں بیان کر چکا ہوں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب تم میری ہدایت کے مطابق اس میدان میں جس میں تمہیں اختیار دیا گیا ہے تدبیر کرو گے اور منصوبے بناؤ گے، پلین (PLAN) تیار کرو گے، سکیمیں سوچو گے، تو تمہیں تین چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ ایک تو سٹیٹسٹکس (STATISTICS) یعنی اعداد و شمار تمہارے سامنے ہونے چاہئیں۔ ورنہ تمہارے منصوبہ کی وہ غرض پوری نہیں ہو گی جو میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ذریعہ پوری کروں۔ پھر جب تم ان اعداد و شمار کو اپنے سامنے رکھو گے، تو غور و فکر کر کے تمہیں کچھ فیصلے کرنے پڑیں گے اور تیسرے جب تم کچھ فیصلے کرو گے تو تمہارے بہت سے فیصلے جزا کے طور پر ہوں گے یعنی ان کے نتیجہ میں کسی فرد کو یا کسی گروہ کو بدلہ مل رہا ہو گا۔ تمہارے یہ تینوں عمل خالصتہً میرے لیے ہونے

چاہئیں اور اس غرض سے ہونے چاہئیں کہ میرا رنگ تمہاری صفات پر چڑھے اور تم میری صفات کے مظہر بننے کے قابل ہو جاؤ۔

فرمایا جو حساب ہے یعنی اعداد و شمار ہیں وہ خالصتہً میرے لیے اکٹھے کیے جائیں۔ اعداد و شمار کو چھپایا نہ جائے، نہ بدنیّتی سے استعمال کیا جائے۔ یہ معمولی حکم نہیں ہے بلکہ بڑا اہم حکم ہے کیونکہ ہم اس دنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ جب اعداد و شمار اکٹھے کیے جاتے ہیں تو ان میں انسان (جو اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانتا) بڑا دجل بھی کرتا ہے۔ مثلاً تنزانیہ (مشرقی افریقہ) سے جب غیر ملکی عیسائی حکومت جانے لگی تو اس کو پادریوں نے یہ تاثّر دیا کہ وہاں عیسائیوں کی اکثریت ہے اور چونکہ ان لوگوں کا دستور یہ ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو سکے اپنے کام خوبصورت شکل میں کرتے ہیں خواہ اندر سے نیت دجل کی ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ بڑی اچھی بات ہے یہاں عیسائیوں کی اکثریت ہے اِس لیے جب ہم اِس ملک سے جائیں گے تو حکومت عیسائیوں کے سپرد کر دیں گے۔ کیونکہ دنیا میں جمہوریت کا یہی اُصول ہے کہ اکثریت کی حکومت ہوا کرتی ہے۔ انہوں نے شہریوں کے اعداد و شمار اکٹھے کیے۔ سنسز (CENSUS) کے ان اعداد و شمار کے نتیجہ میں انہیں پتہ لگا کہ تنزانیہ میں سب سے زیادہ بد مذہب ہیں، دوسرے نمبر پر مسلمان ہیں اور سب سے کم عیسائی ہیں۔ اب ایک مصیبت پڑ گئی، کیونکہ جس نیّت سے سنسز (CENSUS) کی گئی تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ انہوں نے ملک کی حکومت عام تاثّر کے ماتحت عیسائیوں کے سپرد کر دی اور سنسز (CENSUS) کے نتائج کا اعلان آج تک نہیں کیا۔ پس سٹیٹسٹکس (STATISTICS) کا علم جو اللہ تعالیٰ نے ایک نعمت کے طور پر ہمیں دیا ہے انسانی ذہن اس کو بھی دجل اور ظلم کی راہوں پر استعمال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم نے یہ کام نہیں کرنے۔ تم جب بھی اعداد و شمار اکٹھے کرو تو یہ مقصد تمہارے سامنے ہونا چاہیئے کہ تمام مادّی اشیا اور اسباب تمام بنی نوع انسان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور سب کے حقوق ادا ہونے چاہئیں قطع نظر اس کے کہ ان کا رنگ کیا ہے، اُن کا مذہب کیا ہے، ان کے خیالات کیا ہیں، ان کے اخلاق کیسے ہیں۔ ان کا جو حق اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے وہ انہیں ملنا چاہیئے۔ کوئی دہریہ ہو یا بد مذہب یا اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو گالیاں دینے والا اور دُکھ پہنچانے والا ہو، اس کی جسمانی اور ذہنی (اخلاقی اور روحانی مطالبات تو ایک اور شکل میں پورے کیے جاتے ہیں) قوتوں کی صحیح نشو و نما کے لیے جن مادی اسباب کی ضرورت ہے وہ اس کے لیے ربّ العالمین نے پیدا کیے ہیں۔ تم بھی جب اپنے کسی منصوبہ کے لیے اعداد و شمار اکٹھے کرو تو اس بات کا خیال رکھو کہ رعایا میں سے کوئی فرد واحد بھی ایسا نہ رہے جس کو اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ حق نہ ملے۔ اعداد و شمار کو غلط رنگ میں استعمال نہیں کرنا، بلکہ اُنہیں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق استعمال کرنا ہے۔

اِس زمانہ میں اعداد و شمار اکٹھے کرنے مشکل نہیں، اس وقت بہت سی سہولتیں حاصل ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہر گھر کے متعلق معلومات حاصل کر کے رجسٹر بنا لیے تھے اور ان کی مادی ضرورتیں ایک اُصول کے ماتحت پوری کی جاتی تھیں اور وہ اصول یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو حق کسی کا قائم کیا ہے وہ اسے مل جائے۔ اور اگر پھر بھی کچھ اموال بچ جائیں تو انہیں بعض دوسرے اُصولوں کے ماتحت تقسیم کر دیا جائے، یعنی اللہ تعالیٰ نے مثلاً

کسی کو اتنی قوتیں اور استعدادیں دی ہیں کہ اموال کی سَو اکائیاں (سَو یونٹ) اس کی کامل نشو و نما کے لیے چاہئیں تو پہلا اصول حضرت عمرؓ نے یہ قائم کیا کہ یہ سَو اکائیاں (یونٹ) اس شخص کو مل جانی چاہئیں خواہ وہ کوئی ہو۔ اور اگر زائد اموال بچ جائیں جیسا کہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اُس ظلم کو دیکھتے ہوئے جو بے نفس صحابہ پر کیا گیا تھا اُنہیں ساری دنیا کے اموال عطا کر دیئے تھے۔ قیصر و کسریٰ کے خزانے اُن کے قدموں میں لا ڈالے تھے۔ پھر بھی وہ بے نفس رہے۔ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری میں انہوں نے اپنی زندگی کے دن گزارے۔ ان کی ضرورتوں (ضرورت سے مراد وہ حق ہے جو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے، اس سے وہ حق مراد نہیں جو دنیا نے خود مقرّر کر لیا ہے) کو پورا کرنے اور ان کے حقوق کی ادائیگی کے بعد اموال بچ جاتے تھے اور یہ اموال جو بچ جاتے تھے ان کی تقسیم کے لیے بھی حضرت عمرؓ نے بعض اصول وضع کیے تھے جن کی تفصیل میں اس وقت جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ ان اصول کے مطابق ان اموال کو تقسیم کر دیتے تھے۔ بہر حال پہلا مطالبہ جو ہمارے ربّ نے ہم سے کیا ہے یہ ہے کہ جب تم اعداد و شمار اکٹھے کرو تو وہ اعداد و شمار صحیح ہوں اور پھر جب ان اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر تم کوئی منصوبہ بناؤ، تو اس بات کا خیال رکھو کہ وہ منصوبہ صرف پنجاب کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہ ہو، وہ منصوبہ صرف مشرقی پاکستان کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہ ہو، وہ منصوبہ صرف سندھ کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہ ہو، وہ منصوبہ صرف صوبہ سرحد کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہ ہو، بلکہ وہ ایک ایسا منصوبہ ہو جس سے ہر پاکستانی شہری کو فائدہ پہنچتا ہو ورنہ تم مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ نہیں ہو گے۔ دنیا میں تم چالاکیاں کر کے شاید بعض لوگوں کی نظر میں عزّت بھی حاصل کر لو، لیکن اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں تم صرف اسی وقت عزت حاصل کر سکتے ہو جب تمہارے منصوبے صحیح اعداد و شمار کی بِنا پر اس رنگ میں تیار کیے جائیں کہ اعداد و شمار کے استعمال میں دجل نہ ہو، بے انصافی نہ ہو۔ رعایا کے جن حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری تم پر عائد کی گئی ہے ان سب کے وہ حقوق جو اللہ تعالیٰ نے قائم کیئے ہیں اور جن کی طرف راہنمائی اس شخص یا اُس خاندان یا اس خطّہ کی قوتیں، قابلیتیں اور استعدادیں کر رہی ہیں پُورے ہو جائیں یعنی سارے پاکستانیوں کے حقوق پورے ہو جائیں۔ پھر اگر کچھ بچ جائے یعنی اگر زائد پیداوار ہو تو اس کے متعلق قرآن کریم نے بعض اور احکام دیئے ہیں ان پر عمل کیا جائے گا۔

تیسرے یہ فرمایا کہ اعداد و شمار جو ہوں گے اُن کے متعلق تمہیں کچھ فیصلے کرنے پڑیں گے۔ مثلاً ایک بنیادی فیصلہ تو یہی ہے کہ دجل سے کام نہیں لینا۔ غرض اس کا جو منفی حصّہ ہے وہ تو اس پہلے مطالبہ سے تعلق رکھتا ہے کہ اعداد و شمار کے استعمال کے وقت دجل نہیں کرنا، ظلم نہیں کرنا، بے انصافی نہیں کرنی بلکہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ اصول پر منصوبے بنانے چاہئیں اور اعداد و شمار کا جو صحیح استعمال ہے وہی استعمال ہو غلط استعمال نہ ہو۔

۱۹۴۷ء میں جب باؤنڈری کمیشن بیٹھا تو اس کمیشن کے سامنے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے دجل کیا گیا۔ ہندوؤں نے یہ دجل کیا کہ انہوں نے باؤنڈری کمیشن کے سامنے یہ بات پیش کر دی کہ گو ضلع گورداسپور کی مجموعی آبادی میں مسلمان زیادہ ہیں لیکن ضلع کی بالغ آبادی میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اور چونکہ ووٹ بالغ آبادی نے دینا ہے اس لیے

یہ ضلع بھارت میں شامل ہونا چاہیئے۔ ہم جب وہاں سے واپس آئے تو ہم سب بہت پریشان تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے میرے ذہن میں یہ ڈالا کہ اگر ہمیں ۱۹۳۵ء کی سنسز رپورٹ (CENSUS REPORT) مل جائے کہ اس وقت تک سب سے آخر میں ۱۹۳۵ء میں ہی سنسز (CENSUS) ہوئی تھی اور ایک کیلکولیٹنگ مشین (CALCULATING MACHINE) مل جائے جو جلد جلد ضرب اور تقسیم کرتی ہے تو میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے راتوں رات ایک ایسا نقشہ تیار کر سکتا ہوں کہ اس سے ضلع گورداسپور کی بالغ آبادی کی صحیح تعداد سنسز (CENSUS) کے اصول کے مطابق معلوم ہو جائے گی۔ سنسز (CENSUS) کے متعلق انہوں نے بعض اصول مقرر کیے ہوئے ہیں اور انہوں نے عمر کے لحاظ سے گروپ بنائے ہوئے ہیں اور ہر گروپ کی وفات کی فی صد انہوں نے مقرر کی ہوئی ہے۔ وہ تو ایک سال کی عمر سے شروع کرتے ہیں لیکن ہم نے ایسی عمر سے یہ کام شروع کرنا تھا کہ انہیں ۱۹۴۷ء میں بلوغت تک پہنچا دیں۔ مثلاً انہوں نے یہ اصول بنایا ہوا ہے کہ تین سال کی عمر کے بچے چار سال کی عمر کے ہونے تک سو میں سے پچانوے رہ جائیں گے۔ پھر چار سال سے پانچ سال کی عمر کے ہونے تک وہ سو میں سے اٹھانوے رہ جائیں گے۔ بہرحال اُنہوں نے بعض اسی قسم کے اصول وضع کیے ہوئے ہیں اور ہمیں ہر گروپ کو ضربیں اور تقسیمیں دے کر ہندوؤں اور مسلمانوں کی علیحدہ علیحدہ تعداد نکالنی تھی۔ اور وہ تعداد معلوم کرنی تھی جو ۱۹۴۷ء میں بالغ ہو چکی تھی۔ اور جو پہلے بالغ تھے ان کی تعداد تو پہلے ہی دی ہوئی تھی، مَیں نے حضرت فضل عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں عرض کیا تو حضور نے فوراً مناسب انتظام کر دیا۔ راتوں رات مجھے شاید پچاس ہزار یا ایک لاکھ ضربیں دینی پڑیں اور تقسیمیں کرنی پڑیں۔ لیکن بہرحال ایک نقشہ تیار ہو گیا اور اس نقشہ کے مطابق ضلع گورداسپور کی مسلم بالغ آبادی کی فی صد مجموعی لحاظ سے کچھ زائد تھی، کم نہیں تھی۔ اگلے دن صبح جب مکرم چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب نے یہ حساب پیش کیا تو ہندو بہت گھبرائے کیونکہ وہ تو اپنے آپ کو حساب کا ماہر سمجھتے تھے اور انہیں خیال تھا کہ مسلمانوں کو حساب نہیں آتا۔ بہرحال میں بتا رہا تھا کہ اعداد و شمار کو ظالمانہ طریق پر بھی استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ربّ کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تمہیں سٹیٹسٹکس (STATISTICS) یعنی اعداد و شمار پر اپنے منصوبہ کی بنیاد رکھنی پڑے گی لیکن ان اعداد و شمار کا استعمال مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ اس میں دجل نہیں ہونا چاہیئے، ظلم نہیں ہونا چاہیئے، بے انصافی نہیں ہونی چاہیئے، حق تلفی نہیں ہونی چاہیئے اعداد و شمار کا استعمال ہماری ہدایت کے مطابق ہو۔

غرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اعداد و شمار جب تمہارے سامنے آئیں گے تو تمہیں کچھ فیصلے کرنے پڑیں گے۔ مثلاً یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کپڑا بننے کے کتنے مزید کارخانوں کی ضرورت ہے۔ شکر کے کارخانے کتنے اور چاہئیں، لوہا کتنا چاہیئے سیمنٹ کتنا چاہیئے۔ ہزار قسم کی چیزیں ہیں جن کی آج دنیا میں ضرورت پڑتی ہے۔ ان میں سے ہر چیز کے متعلق فیصلہ کرنا پڑے گا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ فیصلہ اس کی صفات کے پَرتو کے نیچے ہونا چاہیئے، تا تم اس کی رحمت کے سایہ تلے

رہو اور اس لیے اس کی رحمت کے سایہ تلے رہو کہ اس طرح تم اُس کی صفات کے مظہر بن جاؤ۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنی قضا اور فیصلے کو بنیادی رنگ میں کس طرح پیش کیا ہے، کیا تعلیم دی ہے، کیا بتایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات جب فیصلے کرتی ہیں تو ان کی کیا شکل ہوتی ہے۔ جب ہم قرآن کریم پر اس لحاظ سے غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ سورۃ مؤمن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ۔ (آیت ۲۱) جب اللہ تعالیٰ فیصلہ کرتا ہے تو وہ حق و حکمت کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔ اس لیے اس نے فرمایا اَے میرے بندو! جب تم یہ فیصلہ کرو کہ اقتصادی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کس قسم کے منصوبے تیار ہونے چاہئیں تو "حق" کو مدِنظر رکھو۔ "حق" کے لفظ کو عربی زبان موافقت اور مطابقت کے معنے میں استعمال کرتی ہے۔ لیکن میں چونکہ اقتصادیات کا ذکر کر رہا ہوں اس لیے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ حقوق کے مطابق تمہارے فیصلے ہونے چاہئیں۔ اس کے معنے یہی ہیں کہ وہ فیصلے حکمت کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہوں۔ یہ بات بھی حقوق کے اندر ہی آ جاتی ہے۔ مثلاً حکیمانہ فیصلہ یہ ہو گا کہ ہر عمر کے لحاظ سے جس قسم کی غذا ہماری رعایا کو چاہیئے وہ غذا اُس عمر کے گروپ کے لیے مہیا کی جائے اور منصوبہ اس کے مطابق بنایا جائے۔ مثلاً دودھ ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک دودھ بڑا ضروری ہے۔ بڑی دیر کی بات ہے مَیں جب انگلستان میں پڑھا کرتا تھا اس وقت بھی انگریز قوم کو اس طرف توجہ تھی اور لوگ بڑا اچھا خالص دودھ موٹروں (وینز (VANS) میں جو سامان اٹھانے کے لیے ہوتی ہیں) میں لادے چھوٹے چھوٹے دیہات اور قصبوں میں بھی پھرتے رہتے تھے۔ بعض دفعہ بعض بچوں کو میں نے اس نیت سے اپنے ہاتھ سے دودھ پلایا کہ مجھے ان کے اخلاق اور عادات کے متعلق علم حاصل کرنا ہوتا تھا اور میں چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ بے تکلّف ہو جائیں۔ اسی طرح سکولوں وغیرہ میں بھی خالص دودھ مہیا کیا جاتا تھا۔

یہ تو ایک مثال ہے۔ اصول یہ ہے کہ ہر عمر کے لحاظ سے مختلف قسم کی غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ جس قسم کی غذا کی کسی عمر کے بچے کو ضرورت ہے وہ غذا اُسے ملنی چاہیئے۔ پھر ایک ہی عمر میں بچے کانسٹی ٹیوشنلی (CONSTITUTIONALLY) یعنی بناوٹ کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں اور بناوٹ کا یہ اختلاف، اختلافِ غذا کا تقاضا کرتا ہے۔ ایک بچہ ایسا ہے جس کا جسم زیادہ دودھ مانگ رہا ہے۔ ایک بچّہ ایسا ہے جس کا جسم زیادہ پروٹینز (PROTEINS) مانگ رہا ہے ایک بچّہ ایسا ہے جس کا جسم زیادہ سٹارچ (STARCH) مانگ رہا ہے۔ ایک بچّہ ایسا ہے جس کا جسم زیادہ فیٹ (FAT) یعنی چکنائی اور مکھّن وغیرہ مانگ رہا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے فیصلے حکمت کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہوں۔ مَیں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں کہ رب العالمین نے جو قوتیں عطا کی ہیں ان کی کامل نشو و نما ہونی چاہیئے اور اس کامل نشو و نما کے لیے ایک بچّہ کا جسم ہمیں کچھ کہہ رہا ہے اور دوسرے بچّہ کا جسم ہم سے کچھ اور مطالبہ کر رہا ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے فیصلے حکمت کے ماتحت ہونے چاہئیں۔ اور جس قسم کی پُکار کسی کی قوت اور استعداد کی ہے اس پکار کو سُننا تمہارا فرض ہے اور اس کی ضرورت کو پورا کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔

پھر اس میں یہ بھی آجاتا ہے کہ فیصلہ کرتے وقت ساری رعایا کا خیال رکھنا چاہیئے اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ساری رعایا سے مراد میری اس کی مجموعی حیثیت نہیں، بلکہ اس کے گروپ بنائے جائیں، کیونکہ کسی گروپ کا زبانِ حال سے اقتصادی لحاظ سے کچھ مطالبہ ہے اور کسی کا کچھ مطالبہ، اور یہ سارے مطالبے پورے ہونے چاہئیں کیونکہ اگر ہم یہ مطالبے پورے نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ کی عطا کی نشو ونما اپنے کمال تک نہیں پہنچ سکتی اور مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے نشو ونما میں اپنے کمال تک پہنچے اور یہی مقصود ہے اسلام کی اقتصادی تعلیم کا۔ اور اس کے لیے ساری تفصیل اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتائی ہے۔

"حق" کے معنے بہت وسیع ہیں اور یہ آیت جو میں نے ابھی پڑھی ہے انسان کے ہر شعبۂ زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے، لیکن میں اس وقت اقتصادیات کے متعلق بات کر رہا ہوں اور بار بار اس بات کو اس لیے دہراتا ہوں تا کسی کے دماغ میں خلط یا اشتباہ پیدا نہ ہو۔ بہر حال حق کے معنیٰ کے اندر یہ آتا ہے کہ اقتصادی حقوق کی ادائیگی کے لیے کس چیز کو مدّنظر رکھا جائے یعنی جن اندازوں کے مطابق کوئی چیز چاہیئے ان کے لحاظ سے وہ چیز پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور جس وقت اُس چیز کی ضرورت ہو اس کو فورسی (FORESEE) کرنا حقّ کا تقاضا ہے۔ مثلاً پہلے یہ اندازہ لگایا جائے گا کہ اگلے دس سال کے بعد پاکستان کی آبادی اتنی ہو جائے گی اور پھر اس آبادی کو مدّنظر رکھ کر اس وقت کے لیے منصوبہ تیار کرنا یَقْضِیْ بِالْحَقِّ کے اندر آجاتا ہے۔ حق کے لغوی معنیٰ کے اندر یہ بات پائی جاتی ہے کہ وقت اور اندازہ کا خیال رکھا جائے یعنی یہ بات اس کے معنی کے اندر پائی جاتی ہے کہ ایسے وقت میں وہ چیز حاصل ہو، جب اس کی ضرورت لاحق ہو۔ کئی ایسی چیزیں ہیں جن کے لیے دس سال پہلے تیاری کی جاتی ہے۔ مثلاً غذا کا مسئلہ ہی ہے، پہلے ہمارے ملک میں غذا کی پیداوار میں کمی ہو گئی تھی، اب ہمارے ملک میں غذا کی پیداوار ضرورت کے مطابق ہو گئی ہے، لیکن چونکہ آبادی بڑھ رہی ہے اس لیے منصوبہ بناتے وقت آج ہمیں دس سال بعد کی ضرورت کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے، ورنہ ہم دس سال بعد اپنی ضرورت کو پورا نہیں کر سکیں گے جس کا یہ مطلب بھی ہے کہ "حقّ" کے معنیٰ میں اس طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ آئندہ نسلوں کا خیال رکھنا بھی حالؔ کی نسل پر لازم ہے۔ بہر حال اسلامی اقتصادی تعلیم کا تقاضا ہے کہ ہر شخص کا حقّ جو خدا تعالیٰ نے قائم کیا ہے پورا ہو اور پھر جس وقت کے لیے وہ حق قائم کیا گیا ہو اس وقت وہ حق پورا ہو، یعنی ایک تو یہ ہے کہ آج جو حقوق کسی کے قائم کیے گئے ہیں وہ پورے ہوں۔ لیکن زندگی اور موت ہر ایک کے ساتھ لگی ہوئی ہے کوئی آتا ہے اور کوئی چلا جاتا ہے۔ حقوق کے نقشہ میں ہر آن تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ مجموعی طور پر نسل بڑھ رہی ہے اور نسل بڑھنی ہی چاہیئے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت ہے۔ ہمارے نزدیک اب پھر دنیا میں ایک غلط قسم کا دَور شروع ہوا ہے۔ جس وقت میں پڑھا کرتا تھا اس سے دس پندرہ سال پہلے انگلستان میں ایک بڑی مہم چلی تھی کہ نسل نہ بڑھائی جائے۔ اور جب ہم پڑھا کرتے تھے اس وقت انھوں نے کہا کہ اگر نسل

بڑھنے کی یہی رفتار رہی تو آئندہ سو سال کے بعد کوئی انگریز باقی نہیں رہے گا۔ سب انگریز مر چکے ہوں گے۔ اس لیے زیادہ بچے پیدا کرو۔ انسان چونکہ جاہل ہے، غیب کی باتوں کا اسے علم نہیں، اس لیے وہ غلط اندازے کر کے غلط فیصلے کر جاتا ہے۔ نسل بہر حال اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور وہی رزّاق ہے اس لیے ہمیں اس کی فکر نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن منصوبہ بندی کا جو کام ہے وہ ایک حد تک اور ایک دائرہ کے اندر، اللہ تعالیٰ نے انسان کے سپرد کیا ہے۔ اس دائرے کے اندر جب بھی ہم کوئی منصوبہ بنائیں تو اس میں اگلی نسل کا خیال رکھنا ضروری ہے اور پھر اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ حق کی ادائیگی ہو اور جب بھی کوئی حق پیدا ہو قوم اس کو ادا کرنے کے لیے پہلے سے تیار ہو۔

پھر اللہ تعالیٰ کے جو فیصلے ہوتے ہیں وہ عدل و انصاف پر ہوتے ہیں، اس کے دوسرے معنے یہ کیے گئے ہیں۔ میں تمہیداً بیان کر دوں کہ اس آیت کے جو معنے پہلے کیے گئے ہیں وہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ لیکن

فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ (سورہ یونس : ۴۸)

کے ایک معنیٰ یہ بھی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی اُمّت کی طرف رسول بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ہی عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے کیے جاتے ہیں اور حقوق قائم کیے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی حق قائم کر سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ایسا وجود اور کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو ہر جہت سے کامل ہو اور جو ہر علم پر محیط ہو۔

پس فرمایا: فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النّبیّین کی حیثیت میں ایک کامل اور مکمل شریعت لے کر آئے تو تمام حقوق کو قائم کرنے اور تمام حقوق کی ادائیگی کے متعلق جو تعلیم تھی وہ بھی اپنے کمال کو پہنچ گئی۔

قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ میں پیداوار کی تقسیم کے متعلق ہدایت دی گئی ہے۔ جب کوئی منصوبہ بنایا جاتا ہے تو اس کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک پہلو ہوتا ہے پیدا کرنا اور دوسرا پہلو یہ ہوتا ہے کہ اس منصوبہ نے جو پیدا کیا ہے اس کو تقسیم کرنا۔ اب مثلاً باوجود اس کے کہ ہماری حکومت اور ہمارے ملک کا یہ منصوبہ بڑا کامیاب ہوا ہے کہ ضرورت کے مطابق اجناس ملک میں پیدا ہو جائیں اور اب ہمارے ملک میں مجموعی لحاظ سے غذا کی کمی نہیں ہے، یعنی مجموعی لحاظ سے جتنا کھانا سارے پاکستانیوں کو ملنا چاہیئے تھا وہ پیدا ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود آپ کو ملک میں بھوکے نظر آئیں گے اس لیے کہ رزق تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق پیدا ہو گیا، لیکن اس کی تقسیم جو انسان نے کرنی تھی وہ صحیح نہیں ہوئی، اس کے اندر نقص رہ گیا ہے۔ اسی نقص کی وجہ سے گو گندم وافر مقدار میں ملک میں موجود ہے مگر پیٹ بھوکے ہیں، پیٹ خالی ہیں کیونکہ اُن پیٹوں تک گندم نہیں پہنچتی۔ اس کا انتظام نہیں کیا گیا۔ قُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ میں ہمیں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جب تم کوئی منصوبہ بناؤ، تو وہ منصوبہ خدا تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ایسا ہونا چاہیئے کہ اس میں سب کے **حقوق کا خیال** رکھا گیا ہو۔ اور اگر تم خدا کی ہدایت پر عمل کرو گے تو ایسا ہوگا کہ اس کی

تقسیم بھی منصفانہ ہوگی اور پھر اس کے بعد کوئی پیٹ بھوکا نہیں رہے گا، کوئی تن ننگا نہیں رہے گا۔ کوئی خاندان بغیر سایہ کے نہیں رہے گا۔ کوئی بیمار یہ حسرت دل میں لے کر نہیں مرے گا کہ میرا علاج ہونا چاہیئے تھا مگر مجھے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ نہ ننگ نظر آئے گا اور نہ کوئی ہاتھ مانگنے کے لیے دوسرے کے سامنے پھیلے گا۔ ہر شخص کی عزّت قائم ہوگی۔ ہر شخص کو اس کا حق مل رہا ہوگا۔ لیکن حق وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے، وہ حق نہیں جو لوگ اپنی طرف سے بنالیں۔

تیسری بات جو منصوبہ بناتے وقت مدِّنظر رکھنی چاہیئے جزا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ جزا بھی مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ کے ماتحت ہو یعنی خالصۃً اللہ کے لیے ہو۔ میں نے شروع میں اشارہ کیا تھا کہ جب ہم کوئی منصوبہ بناتے ہیں تو بہت سوں کو کچھ بدلے بھی دئے جاتے ہیں۔ یہ منصوبہ کا ایک لازمی حصّہ ہے۔ لیکن چونکہ وقت زیادہ ہوگیا ہے اس لیے اس حصّہ کو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میں انشاء اللہ اگلے جمعہ بیان کرونگا۔

(الفضل ۶ نبوۃ/نومبر سنہ ۱۳۴۸ ہش/۱۹۶۹ء)

کارکنوں کی اُجرت اُن کی بہترین کارکردگی کے مطابق معیّن ہونی چاہیئے

خطبہ جمعہ فرمودہ ۳- اخاء (اکتوبر) ۱۳۴۸ ہش/۱۹۶۹ء

بمقام مسجد مبارک، ربوہ

"اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ اگر انسان اس کی صفات کا مظہر بننا چاہتے ہیں، تو انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے ماتحت کے سب سے اچھے عمل اور اس کی سب سے اچھی کارکردگی کے مطابق اُسے اُجرت یا مزدوری دیا کریں اور اسی اصول کے مطابق پنشن مقرر ہونی چاہیئے"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور ایدہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَیں نے گزشتہ خطبہ میں بتایا تھا کہ تدبیر اور منصوبہ اور PLANNING (پلاننگ) کا وہ حصّہ جو انسان کے اختیار میں دیا گیا ہے اور جس کے متعلق یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بنتے ہوئے اپنی تدابیر کیا کرو، یا اپنا منصوبہ بنایا کرو۔ اس تدبیر کے ساتھ یا اس منصوبہ بندی کے ساتھ تین چیزوں کا تعلق ضروری ہے۔ اوّل: اعداد و شمار اکٹھے کرنے کا، دوم: اُن اعداد و شمار کے پیشِ نظر منصوبہ بندی کی تفاصیل طے کرنے کا۔ مَیں نے گزشتہ خطبہ جمعہ میں اپنے اس مضمون میں جو اقتصادیات سے تعلق رکھتا ہے۔ ان دو باتوں کے متعلق جو دراصل "الدّین" کے دو معنوں (نویں اور دسویں تقاضے) پر مشتمل ہیں بیان کیا تھا۔ آج اس منصوبہ بندی کی تیسری شق یعنی الدّین کے گیارھویں معنے کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہوں۔

"الدّین" کے گیارہویں معنے یہ ہیں کہ جو بھی تدبیر کی جاتی ہے یا جو بھی منصوبہ بنایا جاتا ہے اس کے ایک بڑے حصّے کا تعلق جزا اور بدلے سے ہوتا ہے۔ پس ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب بھی منصوبہ بندی میں ایسے فیصلے کیے جائیں کہ جن کا تعلق جزا یا بدلہ دینے سے ہو تو اس میں بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بننا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہیئے۔ جب ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کے ان جلووں کو جنہیں قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے دیکھتے ہیں اور ان پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جزا یا بدلہ دینے کے لیے جو جلوے ہیں وہ اصولی طور پر ان آیات میں بیان ہوئے ہیں جن کی میں اس وقت مختصراً تفسیر بیان کرونگا اللہ تعالیٰ سورہ عنکبوت میں فرماتا ہے:-

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِیْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (آیت ۸)

کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے جلوے جزا اور بدلہ دینے کے سلسلہ میں اس طرح ظاہر ہوتے ہیں کہ انسان کے اعمال کی جو بہترین جزا ہو سکتی ہے وہ جزا اللہ تعالےٰ اسے عطا کرتا ہے یعنی انسانی اعمال کی جزا یا بدلے کا تعلق ان جلووں کے ماتحت ہوتا ہے جس کا ذکر اس آیۂ کریمہ میں کیا گیا ہے۔

پس ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب ہماری منصوبہ بندی بدلہ دینے کے فیصلے کرے تو یہ فیصلے بہترین بدلہ کے مظہر ہونے چاہئیں۔ بہترین بدلہ محض مزدوری یا اجرت کے اصول پر نہیں دیا جا سکتا۔ ایک تو اس لیے کہ یہ ایک اندھا اصول ہے اِس

کی رُو سے مثلاً ایک اچھے کام کرنے والے UNSKILLED (غیر ماہر) مزدور کو بھی عام طور پر وہی تنخواہ دی جاتی ہے جو ایک درمیانے درجے کے ایسے مزدور کو ملتی ہے۔ ایک بڑے عقلمند اور بڑے ذہین اور بڑی توجہ سے کام کرنے والے کلرک یا کسی کارخانے کے افسر کو جس کی کارکردگی کے نتیجہ میں پیداوار میں معتدبہ اضافہ ہوتا ہے اور آمدنی میں بڑی ترقی ہوتی ہے ایک مقررہ تنخواہ دی جاتی ہے اگر اس کی جگہ کوئی درمیانے درجہ کا افسر آجائے تو اس کو بھی وہی تنخواہ ملے گی جو اس اچھے افسر کو دی جاتی رہی ہے حالانکہ اُن دونوں کی حسنِ کارکردگی میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا اظہار اس قسم کے اندھے ماحول سے پاک ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو نور ہی نُور ہے اور وہ تو بصارت اور بصیرت کا منبع اور سرچشمہ ہے اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے اور اس کی تمام صفات کی طرح یہ جزا اور بدلہ دینے کی صفت بھی ہر چیز کی ضرورت کے مطابق جلوہ گر ہوتی ہے۔

پس ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ تمہارے اقتصادی نظام میں جب بھی اُجرتوں کی ادائیگی کا سوال پیدا ہو تو اس وقت اس بات کو بھولنا نہیں چاہیئے کہ کام کرنے والے ہر مزدور یا کلرک کو، ہر افسر یا منتظم یا مینجر کو اس کام کی بہترین اجرت ملنی چاہیئے تاہم انسان کا علم محدود ہے اور اس کے راستہ میں ہزار روکیں ہیں اور اس نقص اور کمزوری ہی کے نتیجہ میں تنخواہ کا اصول بنایا گیا۔ بالعموم کمزوری دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو اس لحاظ سے کہ انسان کا علم ناقص ہے۔ ہر چیز انسان کے سامنے نہیں ہوتی۔ اور دوسری کمزوری یہ ہے کہ جو بات اس کے اختیار اور طاقت میں ہے اس میں بھی وہ کمزوری دکھاتا ہے وہ اتنی محنت نہیں کرتا جتنی اسے کرنی چاہیئے تھی اور جس کی وہ قدرت رکھتا تھا۔ مثلاً ایک کارخانہ ہے اس میں پانچ سو یا ایک ہزار مزدور کام کر رہا ہے تو اگر اسلامی اصول کو اس میں پوری طرح لاگو کیا جائے تو یہ ضروری ہوگا کہ ایک رجسٹر ہو جس میں ہر مزدور کی کارکردگی درج ہو کیونکہ اس کی مزدوری یعنی اس کے کام ہی نے یا اس کی توجہ اور اس کی محنت ہی نے اس کارخانے کی مجموعی پیداوار پر ایک خاص اور خوشکن اثر ڈالنا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ سارے مزدوروں کا پیداوار میں ایک جیسا حصّہ نہیں ہے کیونکہ ہر ایک کی قابلیت اور توجہ کا معیار الگ الگ ہے ایک مزدور ہے جس میں زیادہ قابلیت ہی نہیں، اپنی قابلیت کے لحاظ سے وہ بے شک پوری توجہ بھی دیتا ہے لیکن کم قابلیت ہونے کی وجہ سے وہ اتنا پیدا نہیں کر سکتا نہ پیدا کرتا ہے کہ جتنی پیداوار ایک دوسرے مزدور کی ہے۔ پس جب تک پورے حالات سامنے نہ ہوں اس وقت تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کس کو کتنی اُجرت ملے اور پھر یہ بھی کہ ایسی اُجرت بہترین اجرت بھی کہلا سکتی ہے یا نہیں۔ ہمارے ہاں اُجرتوں کا جو اصول کارفرما ہے اس کی رُو سے شاید مزدوریوں یا اجرتوں میں فرق کرنا مشکل ہو جائے۔ چنانچہ اس مشکل کو دُور کرنے کے لیے انسانی ذہن نے ایک اور راستہ بھی سوچا ہے اور مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اس راستے کو صحیح اور پورے طور پر اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ کی اس صفت کے جلوے اُجرتوں کی تعیین کے سلسلہ میں ہم اپنی زندگیوں میں دکھا سکتے، اور اس طرح ہم بھی اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر بن سکتے ہیں اور یہ مزدوروں کو بونس دینے کا رواج ہے۔ مختلف کارخانے اپنے مزدوروں کو مختلف شکلوں میں مختلف نسبتوں سے بونس دیتے ہیں۔

لیکن اسلامی اصولِ ادائیگیٔ اُجرت کے مطابق اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ ہدایت دی ہے کہ اس کے مطابق اجرتوں کی تعیین کرنی چاہیئے شاید ہی کوئی کارخانہ ہو جو عمل کر رہا ہو۔

پس اگر ایسے رجسٹر ہوں جن میں ہر ایک مزدور کی حُسنِ کارکردگی درج ہو تو سب مزدوروں کو ایک جیسی مزدوری ملنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور اسی طرح جب سال گزرنے کے بعد نفع کا حساب لگایا جائے، مثلاً ایک کارخانے کو پچاس لاکھ روپیہ نفع ہُوا، اس نفع میں سارے شریک ہیں۔ یا اکثر شریک ہوں گے، لیکن اُن کا حِصّہ مختلف ہونا چاہیئے کیونکہ ایک وہ مزدور ہے جس کی قابلیّت بھی زیادہ تھی اور جس نے محنت بھی زیادہ کی اور جس نے کام بھی زیادہ توجہ اور محبت و پیار سے کیا اور اس نیت سے زیادہ کام کیا کہ اس طرح زیادہ سے زیادہ پیداوار جو مَیں کر سکتا ہوں وہ میں کرونگا۔ پس ایسے قابل، ذہین، محنتی اور نیک نیّت مزدور کا حِصّہ بہرحال زیادہ ہونا چاہیئے۔ اس کے برعکس ایک ایسے مزدور کا حِصّہ جس میں اتنی قابلیت بھی نہیں، توجہ اور محنت سے کام کرنے کی اسے عادت بھی نہیں، سُستی سے کام کرتا ہے۔ وہ نہیں ہونا چاہیئے جو ایک اچھے مزدور کا ہے۔ پس مجموعی نفع میں حصّہ دار بنانے میں ہر ایک کی حسنِ کارکردگی مدّنظر رکھنی چاہیئے۔

بہرحال حکم یہی ہے کہ تم بہترین عمل بجالاؤ۔ تمہاری کارکردگی سب سے اچھی ہونی چاہیئے۔ اور پھر جس کی جتنی کارکردگی ہے اس کے مطابق مجموعی نفع میں اس کا حِصّہ معین ہونا چاہیئے۔ اس صورت میں بہترین جزا بنتی ہے ورنہ محض تنخواہ یا اجرتوں کے اصول پر بہترین جزا یا بدلہ دینے کی صورت نہیں پیدا ہو سکتی۔ اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب میں اَحْسَنَ الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ کے اصول کے مطابق کسی کے عمل کی بہترین جزا یا بدلہ دیتا ہوں تو تمہیں میری اس صفت کا بھی مظہر بننا چاہیئے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی یہ صفت دنیا میں جلوہ گر ہے اسی طرح تمہیں بھی اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا مظہر بنتے ہوئے اپنی زندگی میں اس قسم کے فیصلے کرتے وقت بہترین جزا، بدلہ دینے کا جلوہ دکھانا چاہیئے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کی صفات میں دوسری قسم کا جلوہ یہ نظر آتا ہے: وَلَنَجْزِیَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ (النحل ۱۶: ۹۸) پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ میں بہترین جزا دیتا ہوں۔ یہاں یہ اصول بیان فرمایا کہ مَیں بہترین عمل کے مطابق بدلہ دیتا ہوں یعنی محنت سے کام کرنے والوں پر بہترین کام کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اس بہترین جزا یا بدلہ دینے کی صفت کا جلوہ ظاہر ہوتا ہے۔ ایک شخص مثلاً سال میں بارہ مہینے کام کرتا ہے اور اس کے نو مہینے کی کارکردگی بڑی اچھی ہے لیکن تین مہینے کا کام کسی مجبوری کی وجہ سے جس میں بیماری بھی ہو سکتی ہے، ایسی بیماری جس کے نتیجہ میں رخصت لینے پر مجبور نہیں ہُوا، لیکن جس کی وجہ سے اُس کی کارکردگی پر اثر پڑا پس اس کی اجرت کی تعیین اس کے بہترین کام کے زمانہ کے لحاظ سے ہونی چاہیئے۔ یہ نہیں کہ سمو دیا جائے یا یہ نہیں کہ کم کارکردگی یعنی اُس کی مجبوری کی وجہ سے جو اس کی کارکردگی متاثر ہوگئی تھی اور اس میں کسی قدر نقص واقع ہو گیا تھا اس کے مطابق اس کی اُجرت کی تعیین کی جائے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دراصل اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ کام کرنے والا خواہ مزدور ہو یا کلرک۔ کوئی اور منتظم ہو یا مینجر، جو بھی ہو اسے اپنی قوت اور قابلیت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے پوری توجہ اور محنت سے کارکردگی دکھانی چاہیئے اور

جنھوں نے ان کی اُجرت چکانی تھی اور ان کی مزدوری کی تعیین کرنی تھی، ان سے یہ فرمایا اُن کی اجرت کی ادائیگی ان کے بہترین کام کے زمانہ کے مطابق ہونی چاہیئے ، یعنی وہ زمانہ جو اُن کی کارکردگی کا بہترین زمانہ ہے اس کے مطابق ان کی اُجرت یا مزدوری کا فیصلہ کرنا چاہیئے ۔ یہ فیصلہ خواہ تنخواہ کی صورت میں ہو یا مجموعی نفع میں شرکت کی صورت میں ، دونوں صورتوں میں بہترین کارکردگی کے مطابق اجرت معین ہونی چاہیئے ۔ اس صورت میں ایک اچھے مزدور کو اُن ایام میں بھی وہی کچھ ملے گا ، جن میں وہ بیمار رہا ہے ۔ بیماری کی وجہ سے اس کو چھٹی لینی پڑی ہو یا بیماری کی وجہ سے اس کی کارکردگی متاثر ہوئی ہو ۔ بعض دفعہ مثلاً ہلکے سردرد کی وجہ سے انسان سمجھتا ہے کہ مَیں اتنا بیمار نہیں کہ رخصت لُوں ، لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اتنا تندرست بھی نہیں کہ حسب معمول زیادہ قابلیت اور محنت اور توجہ سے بہترین کام انجام دے سکے ، لیکن جب عذر جائز ہو اور بہانہ جُو طبیعت کا تقاضا نہ ہو ، صحیح عذر ہو ، واقع میں وہ بیمار ہو ، رخصت لینی پڑے یا بیماری کی وجہ سے اس کے کام پر اثر پڑا ہو ، تو اس کے کام میں اس نقص کی بنا پر اس کی تنخواہ یا اس کے نفع کے متوقع حصّہ پر اثر نہیں پڑنا چاہیئے بلکہ اس کا جو بہترین کام ہے اور بہترین کارکردگی رہی ہے اس کو اس کے مطابق ہی اجرت ملے گی ۔ اگر وہ خدانخواستہ بیمار ہو جائے تو بیماری کے ایام میں پوری اُجرت ملے گی ۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں بہترین عمل کی بہترین جزا سے متعلق جو حکم دیا ہے اس پر ہمیں بھی غور کرنا چاہیئے ۔ ہمارے صدر انجمن احمدیہ اور تحریک جدید میں ایسا نہیں ہوتا ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے کارکنان اللہ تعالیٰ کے فضل سے ، خواہ ہم اُن کو واقفِ کہیں یا نہ کہیں ، بہرحال وہ ایک طرح کے واقفِ زندگی ہی ہیں ، کیونکہ وہ قربانیاں دیتے ہیں ، اپنے حقوق کو چھوڑتے ہیں (قربانی کا آخر یہی مطلب ہے نا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنے حقوق کو چھوڑ دیتا ہے) پس اگر اس طرف پہلے توجہ نہیں ہوئی تو اب اگر یہ ممکن ہو ، ہماری اتنی آمدنی ہو کہ ہم بیماری کی رخصتوں میں اپنے کارکنان کو پوری تنخواہ (جو کہ پہلے ہی کم ہے) دے سکیں تو ان کو ضرور دینی چاہیئے ۔ ویسے ہمارے سارے کارکنان خوشی سے قربانی دے رہے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کسی دوسرے رنگ میں ان کی اس قربانی کی انشاء اللہ بہترین جزا عطا فرمائے گا ۔ لیکن اقتصادی دنیا کے لیے اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ نے یہ قانون وضع کیا ہے اور اپنے اس جلوہ کا اظہار فرمایا ہے کہ مَیں جو سب سے اچھا عمل ہو اُس کے مطابق جزا دیا کرتا ہوں ، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ اگر انسان اس کی صفات کا مظہر بننا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے ماتحت کے سب سے اچھے عمل اور اس کی سب سے اچھی کارکردگی کے مطابق اُسے اجرت یا مزدوری دیا کریں ۔ اور اسی اصول کے مطابق پنشن مقرر ہونی چاہیئے ۔ ویسے روحانی لحاظ سے انسان کی پنشن اس کی موت کے بعد کی نئی زندگی سے شروع ہوتی ہے ۔ موت حقیقۃً اس زندگی کا اختتام نہیں ، بلکہ ایک نئی زندگی کی ابتدا ہے اور یہیں سے روحانی طور پر پنشن کا آغاز ہوتا ہے اور اُس دوسری زندگی میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہی اصول ہے کہ بہترین عمل کے مطابق جزا ملے گی ۔ لیکن اس دنیا کے حقوق کو اللہ تعالیٰ نے اس بنیادی اصول پر قائم کیا ہے کہ اس شخص یا اس کے خاندان کی قابلیتوں کے مجموعہ کی نشوونما کے کمال کے لیے جس چیز کی اسے ضرورت ہے وہ اُسے ضرور ملنی چاہیئے ۔

اس دنیا میں انسان جس وقت پنشن کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس وقت عام طور پر اس کے خاندان کے بہت سے افراد خود کمانے کے قابل ہو جاتے ہیں اور اس کے پندرہ بیس سال پہلے کے حقوق نہیں رہتے بلکہ کم ہو جاتے ہیں ۔ ان حقوق کو مدّنظر رکھ کر اگر کم پنشن بنتی ہو تو پھر ٹھیک ہے ۔ اس کی تنخواہ کا نصف اس کی پنشن مقرر ہو گی یا مثلاً بیس سالہ سروس ہے تو شاید تنخواہ کا $\frac{1}{3}$ حصّہ بطور پنشن کے ملتا ہے ۔ یہ سارے اصول بنے ہوئے ہیں لیکن ان اصولوں کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اس اصول پر ہونی چاہیئے جس کا جلوہ اس نے دکھایا ہے کہ جب بھی جزا یا بدلہ دینے کا سوال پیدا ہو میری صفات کے اس جلوہ پر عمل کرتے ہوئے بہترین جزا یا بدلہ کے طور پر مجموعی اجرت یا مجموعی نفع حصّہ رسدی دینے کی کوشش کی جائے ۔

اس دنیا میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جن کی شادی بڑی عمر میں ہوئی یا جن کے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت بعض بڑے بچے فوت ہو گئے اور جس وقت وہ اپنی پنشن کی عمر کو پہنچے تو اُن کی ساری اولاد تعلیم حاصل کر رہی تھی ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد کو اچھا ذہن بھی عطا کر رکھا تھا ۔ پس اُجرت کے لحاظ سے یہ رحیمیت کے جلوے ہیں ۔ رحمانیت کے جلووں کا علیحدہ اصول ہے ۔ رحیمیت کے جلووں میں یعنی جو اس نے کام کیا ہے اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اس دنیا میں اتنا تنوّع پایا جاتا ہے کہ ایک ہی لاٹھی سے سب کو نہیں ہانکا جا سکتا ۔

پس ایسے پنشن پانے والے جن پر ان کے حالات کے مطابق بوجھ ویسا ہی ہے ، کم نہیں ہوا ۔ کوئی بیٹا کما نہیں رہا ، بچیوں کی شادی نہیں ہوئی ۔ ان کو پنشن پوری تنخواہ کے برابر ملنی چاہیئے سوائے اس کے کہ انسان اپنی سہولت کے لیے رحیمیت کے ان جلووں کو رحمانیت کی صفت کے جلووں کے اندر لے آئے اور اس کی ضرورت کو دوسری طرح پوری کر دے ۔ یہ تو ٹھیک ہے اس صورت میں اُس کی پنشن نصف رہے یا ایک تہائی یا چوتھائی رہے اگر اور صفتِ باری کے جلووں کی مظہریّت میں اُس کے سارے حقوق اس کو مل جاتے ہیں تو فَبِھَا ، اُس کے سارے حقوق اس کو مل گئے ، لیکن اگر رحمانیت کے جلووں کی مظہریّت میں یا ان کے مظہر بننے کی جدوجہد میں اس کے وہ حقوق نہیں ملے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ رحیمیت کے جلوے ان کی حفاظت کر رہے ہیں ۔ اگر رحیمیت کے جلووں سے اس کے بعض حقوق کو نکالنا ہے تو پھر ضروری ہے کہ انسان رحمانیت کے جلووں میں اس کو لے آئے کہ قطع نظر اس کے کہ کسی کی کارکردگی کیا تھی اللہ تعالیٰ نے جو اس کے حقوق قائم کیے ہیں وہ اُنہیں ادا کرنے کی کوشش کرے ۔ بہرحال ہر ایک آدمی کے حقوق ادا ہونے چاہئیں اور اس کو آخری عمر میں ہر قسم کی پریشانیوں سے محفوظ رکھنا چاہیئے ۔

یہ تو تھا اس جزا سے تعلق رکھنے والا مضمون جو کارکردگی کے نتیجہ میں ایسی کارکردگی ، ایسی ذمہ داری ، ایسی محنت جو بڑی نمایاں ہے اور جس کے مطابق دنیا مزدوریاں دیا کرتی ہے اس کے ساتھ تعلق رکھتا تھا ۔ بعض جزا اور اجر یا بدلے ایسے نہیں ہوتے جو ان ظاہری پیمانوں پر پُورے اُتریں ۔ چنانچہ جب منصوبہ بندی ہوتی ہے PRIVATE SECTOR (پرائیویٹ سیکٹر) میں یعنی جہاں مختلف سرمایہ داروں نے روپیہ لگانا ہو بغیر کسی ایسے اصول کے جن کا اللہ تعالیٰ مطالبہ کرتا ہو مختلف لوگوں کو مختلف قسم کے کارخانے لگانے کی اجازت دے دی جاتی ہے یا ایسی شرائط عائد کی جاتی ہیں جن کا تعلق اس کے حق سے نہیں

بنتا وہ حق جو اللہ تعالیٰ نے معین اور قائم فرمایا ہے، مثلاً ایسے اشخاص جو کارخانہ کھولنے کے متمنّی ہوتے ہیں ان سے کہہ دیا جاتا ہے کہ BANK BALANCE (بینک بیلنس) دکھاؤ یا دوستیاں ہیں یا سفارشیں ہیں وغیرہ وغیرہ ہزار قسم کی نااِنصافیاں اس اقتصادی دنیا میں چل رہی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں بھی اپنی بعض صفات کے جلووں کا ذکر قرآن کریم میں فرمایا ہے مثلاً آج یا کل کے اخبار میں تھا کہ شکر کے کچھ اور کارخانے لگانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح کپڑا بنانے کے کچھ اور کارخانے لگوانے کی بھی ضرورت ہے۔ اب یہ کارخانے لگانے کی کسی نہ کسی پارٹی کو اجازت دی جائے گی۔ ان سے کہا جائیگا کہ ہم سہولتیں دیتے ہیں تم یہ کارخانے قائم کرو۔ یہ بھی دراصل ایک قسم کی جزا یا بدلہ ہے جو ان کو دیا گیا ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس قسم کی اجازت کو بھی جزا یا بدلہ قرار دیا ہے لیکن کس چیز کی جزا؟ کیا اس چیز کی جزا کہ خونی رشتہ تھا؟ کیا اس چیز کی جزا کہ مخلصانہ دوستی تھی؟ کیا اس چیز کا بدلہ کہ یہ پہلے ہی بڑا سرمایہ دار تھا؟ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو قبول نہیں کرتا اور نہ ان کو جائز وجہ قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ وَكَذٰلِكَ نَجْزِىْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ
يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ (طٰہٰ: ۱۲۷-۱۲۸)

فرمایا جو شخص یا گروہ یا جماعت یا MANAGEMENT (انتظام) اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر عمل نہیں کرتی اور اللہ تعالیٰ کی شریعت اور اس کے احکام کو بھلا دیتی ہے وہ رحمت کی تقسیم کے وقت بھی بُھلا دی جاتی ہے اور جو خدائی ہدایت اور شریعت سے باہر نکل جاتا ہے اور اسراف کرتا ہے اور اپنے نفس کے حقوق سے زائد رکھنا چاہتا ہے یا زائد لینا چاہتا ہے اور دوسرے کی حق تلفی کرتا ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہی سلوک ہوتا ہے کہ رحمت کی تقسیم کے وقت اس کو ترک کر دیا جاتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا
كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۝ (الانعام: ۱۵۸)

اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک یہ جلوہ بھی ہے کہ وہ لوگ جو اس کی ہدایت پر عمل نہیں کرتے انہیں اللہ تعالیٰ اس بے عملی کی وجہ سے اس دنیا میں بھی اور اگلی دنیا میں بھی عذاب دیتا ہے اور اس دنیا میں عذاب کی ایک شکل یہ ہے کہ وہ اس کی رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ان دونوں آیات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ اس قسم کا منصوبہ بناتے وقت کہ کس پارٹی کو شکر کا کارخانہ لگانے کی اجازت دی جائے یا کس پارٹی کو کپڑا بنانے کا کارخانہ لگانے کی اجازت دی جائے۔ یہ امر مدّنظر رہنا چاہیئے کہ صرف وہ پارٹی یہ کارخانے لگانے کی مستحق ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے

اقتصادی اصولوں پر عمل کیا ہو اور وہ حقوق اپنے زائد اموال میں سے ادا کیے ہوں جن کے ادا کرنے کی اللہ تعالیٰ نے ہر ایسے شخص کو ہدایت کر رکھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جنہیں اس نے کمانے کی توفیق عطا فرمائی تھی یہ بھی فرمایا تھا کہ ہم نے تمہیں یہ توفیق عطا کی ہے کہ تم اپنے حقوق نیز دوسروں کے حقوق کو پورا کرنے کے لیے جن اموال کی ضرورت ہے اس سے زیادہ کما لو اور یہ اس لیے تھا کہ تم میری بتائی ہوئی ہدایت کے مطابق ان زائد اموال کو (یہاں جب میں زائد اموال بولتا ہوں تو وہ اموال مراد ہیں جو اُن کے اپنے حقوق کی ادائیگی سے زائد ہیں) میرے دوسرے بندوں کے جائز حقوق کی ادائیگی میں خرچ کرو۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو کارخانہ دار اپنی کمائی کے زائد اموال میں سے دوسرے بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں خرچ نہیں کرتا اُس کا یہ حق نہیں ہے کہ اسے ایک نیا کارخانہ کھولنے کی اجازت دی جائے، بلکہ یہ حق تو اس کا بنتا ہے جو اپنے زائد اموال کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں خرچ کرتا ہے لیکن وہ جو اسراف کرتا ہے اور ظلم سے کام لیتا ہے اور اپنے لیے وہ حقوق تسلیم کروانا چاہتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُسے نہیں دیئے اور دوسروں کے حقوق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے اور جو زائد اموال اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کے لیے دیئے گئے تھے یعنی یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ جو اموال ایسے شخص کو دیئے جاتے ہیں اس کے دو حصّے ہوتے ہیں ایک وہ حِصّہ جو اُس کے اپنے حقوق، اُس کے خاندان کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہیں لیکن اُس کے اِن اموال کا دوسرا حِصّہ یہ ہے کہ وہ اپنے اموال کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو بھی حاصل کرے اس کے انعام اور فضل کا وارث بھی بنے یعنی اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق قربانی کرے اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرے مگر یہ شخص اس دوسری ہدایت پر عمل نہیں کرتا اور اسراف کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی جو یہ ہدایت ہے کہ صرف اپنے حقوق لینے کی تمہیں اجازت ہے سوائے اس کے کہ جب ساروں کے حقوق ادا ہو جائیں پھر بھی اموال بچ جائیں اور اس دنیا میں ایسا ہو جاتا ہے۔ پس اس صورت میں اس کو فرمایا کہ مَیں نے تمہارے لیے خرچ کی جو جائز راہیں کھولی ہیں ان پر تم اپنا روپیہ خرچ کر سکتے ہو۔ ناجائز یا حرام اخراجات کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یعنی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اے میرے ربّ! تُو نے مجھے کمانے کی توفیق عطا کی تھی مَیں نے تیری اِس توفیق کے نتیجہ میں ایک سال میں دس لاکھ روپیہ کمایا۔ تُو نے میرے حقوق قائم کیے تھے میں نے اپنے حقوق کے طور پر یا اپنے خاندان کے حقوق کے طور پر یا اپنے DEPENDENTS (ڈِی پنڈنٹس) کے حقوق کے طور پر دو لاکھ روپیہ خرچ کیا۔ آٹھ لاکھ روپیہ جو بچ گیا تھا اُس میں سے مَیں نے تیرے بندوں کے مطالبہ پر (حکومت کے مطالبہ پر) جن کا کام منصوبہ بنانا اور ساری قوم کا خیال رکھنا ہے چھ لاکھ روپیہ ان کو دیدیا اور اس طرح کسی غیر کا کوئی حق میرے ذمّہ باقی نہیں رہا کیونکہ میرے ذمہ جتنے بھی حقوق بنتے تھے وہ میں نے سارے کے سارے ادا کر دئے۔ اب دو لاکھ روپیہ میرے پاس بچتا ہے مجھے اجازت دی جائے کہ جس طرح مَیں چاہوں اسے خرچ کروں، چاہوں تو شراب پیوں، عیش و عشرت میں اپنا وقت گزاروں یا نمائش کروں، اسراف یا ریاء سے کام لُوں، کیونکہ میرے جو حقوق تو نے قائم کیے تھے وہ مجھے مل گئے اور تیرے بندوں کے جو حقوق تھے وہ اُن کو مل گئے اس لیے اس دو لاکھ کے زائد روپیہ کو جائز یا ناجائز راہوں پر خرچ کرنے کی مجھے اجازت ہونی

چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے فرماتا ہے کہ بیشک تو نے اپنی اس ذمہ داری کو نباہا کہ اپنے اور اپنے خاندان کے حقوق کو پورا کیا اور دوسروں کے بھی حقوق کو ادا کیا اور اس ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو گیا۔ مگر ان ساری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے بعد جو تمہارے پاس مال بچ گیا ہے تم اس کو بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ بناؤ، اللہ تعالیٰ کے غضب کو مول لینے کا موجب نہ بناؤ کیونکہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے خلاف کام کرو گے تو اس کے نتیجہ میں تمہاری چاروں قسم کی قابلیتیں جن کی تفصیل پہلے خطبات میں بیان ہو چکی ہے کی صحیح اور کامل نشوونما نہیں ہو سکے گی بلکہ ان کی نشوونما میں روک پیدا ہو جائے گی۔ تمہارا اسراف کرنا، تمہارا ظلم کرنا، تمہارا ریاء کرنا اور تمہارا نمائش کے طور پر اپنے زائد اموال کو خرچ کرنا، یہ ساری چیزیں تمہاری قابلیتوں کو اُجاگر کرنے کا ذریعہ نہیں بنیں گی بلکہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم بنا دیں گی۔ اس لیے اپنے زائد اموال کو اس رنگ میں خرچ کرو کہ تم پر اللہ تعالیٰ کے غضب کی نگاہ نہ پڑے بلکہ تم پر ہمیشہ اس کی رحمت اور اس کے پیار کی نگاہ پڑتی رہے۔

جس عذاب کا سورۂ انعام میں ذکر کیا گیا ہے اس کا ایک حصّہ تو اس دنیا میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً یہی ہے کہ اگر ایک مسلم حکومت کسی کارخانہ دار کو یہ کہے کہ چونکہ تم نے خدا تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اپنے زائد اموال کو خرچ نہیں کیا اس لیے نئے کارخانے لگانے کی تمہیں اجازت نہیں دی جائے گی۔ حکومت کا یہ فیصلہ ہی اُس کی طبیعت کے لحاظ سے اِس دنیا میں اس کے لیے کافی عذاب ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کا یہی منشاء ہو کہ اس کو عذاب ہی ملے (اُس کے غضب سے ڈرتے رہنا چاہیئے) تو اس سے بھی سخت تر عذاب میں بھی وہ مبتلا کر سکتا ہے۔ کیونکہ اگر ذہنیت یہ ہو کہ جو مال ملا ہے وہ سب اپنے پاس ہی رکھنا ہے اور اسے خدا تعالیٰ کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی کا ذریعہ نہیں بنانا تو پھر ایک وقت میں آکر اس کے اموال میں زیادتی کے جو راستے ہیں اگر ان کو بند کر دیا جائے تو یہ اس کے لیے ایک بہت بڑا عذاب بن کر رہ جاتا ہے۔

پس اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں یہ حکم دیا ہے کہ جب تم کوئی تدبیر کرو یا کوئی منصوبہ بناؤ اور تم اس کے لیے نیک نیتی کے ساتھ اعداد و شمار اکٹھے کرو کسی چیز کو پسِ پردہ نہ رہنے دو۔ جہاں جہاں بھی کسی چیز کی ضرورت تھی تم نے اس کے پُورا ہونے یا پُورا کرنے کے لیے فیصلے کیے اور تمہارا اس سے سوائے اس کے کوئی اور مقصد نہیں کہ تم اس کے ذریعہ سے میری رضا حاصل کرو۔ اس لیے تمہارے یہ فیصلے میری صفات کے جلووں کے مظہر بننے کے لیے تھے اور پھر تم نے جو منصوبہ بنایا اُس میں جزا کے دو حصّے ہیں۔ ایک کام کرنے والے کی اجرت کا حِصّہ ہے جس کی ادائیگی "اَحْسَنَ الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ" کے اصول کے مطابق اور "بِاَحْسَنِ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ" کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے عمل میں آنی چاہیئے۔ اگر تمہیں اس اصول کی رُو سے تفصیل طے کرتے میں مشکل نظر آئے یعنی یہ مشکل کہ کسی کی تنخواہ کم اور کسی کی زیادہ ہو تو پھر مجموعی نفع میں حِصّہ دار بناؤ یعنی مزدوروں کی مقررہ تنخواہ یا اُجرت کے علاوہ اُن کو حُسنِ کارکردگی کے مطابق مجموعی نفع میں بھی شریک کرو۔ اور یہ تو کام کرنے والے کی اُجرت تھی۔ اللہ تعالیٰ کی صفت رحیمیت کے جلوے کے ماتحت۔ اللہ تعالےٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس کی صفت رحیمیت کا ایک اور جلوہ تمہاری زندگیوں میں اس طرح بھی نظر آنا چاہیئے کہ ایسے کارخانے دار جو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کی پیروی کرنے والے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے سب

اقتصادی احکام کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، تم ان کی عزت و احترام کرو اور انہیں مزید کارخانے لگانے کی اجازت دو کیونکہ وہ اپنے اور اپنے خاندان اور دوسرے لواحقین کے حقوق کی کما حقہٗ ادائیگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کے حقوق کو بھی پورا کرتے ہیں اور ان ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو جانے کی صورت میں اُن کے پاس جو زائد اموال بچ جاتے ہیں وہ ان اموال کو بھی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اس کی مخلوق کی بہتری اور بہبودی کے لیے خرچ کرتے ہیں لیکن وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے زائد اموال تو اس لیے عطا فرمائے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایتوں کے مطابق جائز طریق پر خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے وارث بنیں لیکن انہوں نے عقل سے کام نہ لیا، غفلت کے پردوں میں پڑے رہے اور اپنے زائد اموال کو اُن راہوں پر خرچ کیا جن راہوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔

فرمایا جب تک یہ دنیا قائم ہے منصوبے تو بنتے رہیں گے جب بھی نیا منصوبہ بنے گا نئے کارخانے لگانے کی ضرورت پڑے گی ایسے لوگ تمہارے پاس آئیں گے اور کہیں گے ہمارے پاس بڑا سرمایہ ہے ہمیں مزید کارخانے کھولنے کی اجازت دی جائے، ایسے وقت ان سے کہہ دیا جائے کہ تمہارے پاس جو سرمایہ ہے وہ ظلم کے نتیجہ میں جمع ہوا ہے اس کی تو تمہیں سزا ملنی چاہیئے نہ کہ انعام۔ انہیں نئے کارخانے لگانے کی ہرگز اجازت نہ دی جائے، البتہ اُن لوگوں کو اجازت ملنی چاہیئے جنہوں نے اِس سے قبل اپنے زائد اموال کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق خرچ کیا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان سے "الدِّیْن" کے معنوی لحاظ سے اقتصادیات سے تعلق رکھنے والے جو گیارہ مطالبے کیے ہیں مَیں نے ان مطالبات پر مشتمل اقتصادی مضمون کو اختصار کے ساتھ اس کی محض اصولی باتوں کو بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

اب اِس مضمون کے دو حصّے باقی رہ جاتے ہیں ایک تو وہ جن کا حق (ابھی تو اصولی طور پر بتایا تھا کہ دوسروں کا بھی حق پیدا ہو جاتا ہے) اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے یعنی ان لوگوں کے متعلق بتانا باقی رہ جاتا ہے۔ جن کے حقوق یا ضروریات اُسی طرح کی ہوتی ہیں جس طرح دوسرے صاحبِ اموال کی ہوتی ہیں مگر اس دنیا میں دنیوی نظاموں کے ماتحت عدمِ انصاف کی وجہ سے یا اور کسی وجہ سے وہ محروم رہ جاتے ہیں یا جن کو بھیک منگا ہونے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ یہ کون کون سے لوگ ہیں؟ قرآن کریم نے اِن کا اصولی طور پر ذکر فرمایا ہے۔ غرض ایک تو ان لوگوں کے متعلق ذکر کرنا باقی رہ گیا ہے اور دوسرے اللہ تعالیٰ نے مجھے علم دیا ہے کہ قرآن عظیم کا یہ سارا مضمون سورۂ فاتحہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس لیے مَیں نے ارادہ کیا تھا کہ اس سارے مضمون کا خلاصہ اور اجمال سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بیان کر دوں تاکہ یہ ساری باتیں اکٹھی ہو کر سامنے آجائیں۔ یہ دو مضامین ابھی باقی ہیں جن پر انشاء اللہ آئندہ روشنی ڈالوں گا۔

(الفضل ۱۹ نبوت سنہ ۱۳۴۸ ہش / نومبر ۱۹۶۹ء)

Mansoor Ahmad Nuruddin

نام کتاب .. .. اسلام کے اقتصادی نظام کے اصول اور فلسفہ

خطبات .. .. حضرت امیرالمومنین حافظ مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالث
ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز، امام جماعت احمدیہ۔

طبع دوم .... ایک ہزار

تاریخ طبع دوم .... ستمبر ۱۹۷۰ء

مطبع .. .. نوائے وقت پرنٹرز، لاہور

الناشر .. .. نظارت اصلاح وارشاد، ربوہ

کتابت .. .. منشی غلام جیلانی ننکانہ صاحب

باہتمام ابوالمنیر نورالحق مینجنگ ڈائرکٹر ادارۃ المصنفین، ربوہ، ضلع جھنگ۔